سبعہ اور عشرہ

اختلافِ قرأت

اور

قرّاء حضرات

از

جامع العلوم، محدث العصر علامہ تمنا عمادی پھلواروی

ناشر

الرحمن پبلشنگ ٹرسٹ (رجسٹرڈ)

مکان نمبر ۳-۷-اے، بلاک نمبر ۱، ناظم آباد کراچی ۷۴۶۰۰

فون : ۶۲۱۳۳۹

سبعہ اور عشرہ

اختلافِ قرأت

اور

قرّاء حضرات

از

جامع العلوم المحدث العصر علامہ تمنّا عمادی پھلواروی

ناشر

الرحمٰن پبلشنگ ٹرسٹ (رجسٹرڈ)

دکان نمبر ۳۔ ۷۔ اے، بلاک نمبر ۱، ناظم آباد، کراچی ۷۴۶۰۰

فون : ۶۲۱۳۳۹

جملہ حقوق محفوظ ہیں

نام کتاب : ..... اختلافِ قرأت اور [illegible] روایات

مؤلف : ..... علامہ تمنا عمادی پھلواروی

صفحات : ۱۹۲

مطبع : .... روحانی ڈائجسٹ پریس ناظم آباد کراچی

قیمت : ..... ایک سو (۱۰۰) روپے صرف

ناشر : ...... الرحمٰن پبلشنگ ٹرسٹ (رجسٹرڈ)

فون : ۴۲۱۳۴۹

فہرست مضامین

مضمون	صفحہ نمبر
تقدیم۔ از : مفتی محمد طاہر مکی	۵
تأثرات بر وفات علامہ تمنا عمادی	۹
حفاظت قرآن کریم کے خلاف ایک اہم محاذ	
محاذ قرأت	
نقطوں اور حرکات کی ایجاد کے نام پر افسانہ پردازی	۲۲
قرآن مجید میں قراءتوں کا اختلاف	۲۳
تمنا عرض کرتا ہے کہ.....	//
ایک تعجب خیز تاریخی حقیقت	۴۴
سوال	۴۷
تاریخ کے نام پر افسانہ طرازی	۵۰
انتخاب معلمین	۵۱
قراء سبعہ کا تعارف	۵۵
(۱) نافع بن عبدالرحمٰن بن ابی نعیم	//
مودودی صاحب کی علمی و تاریخی تحقیق	۵۹
قالون	۶۳
ورش	۶۴
(۲) عبداللہ ابن کثیر قاری مکی	۷۰
داتی اور ان کی کتاب	۷۲
مجاہد بن جبیر	۷۴
حضرت عبداللہ بن مسعود	۷۶
قنبل	۷۸
(۳) ابو عمرو بن العلاء البصری التمیمی	۸۳
سعید بن جبیر بن ہشام الاسدی	۸۶
عکرمہ البربری	۸۸
(۴) عبداللہ بن عامر	۹۶
اہل مدینہ اور قراء کا فکری اتحاد	۱۰۳
(۵) عاصم بن ابی النجود الکوفی	۱۰۷
اساتذہ عاصم	۱۰۸
زر بن حبیش	۱۱۰
عاصم کے دوسرے شاگرد حفص بن سلیمان القاری	۱۱۲

حفص کے تلامذہ	۱۱۳
(۶) حمزہ بن حبیب بن عمارۃ الزیات	۱۱۵
سلیم بن عیسیٰ	۱۱۷
(۷) علی بن حمزہ بن عبداللہ بن قیس **کسائی**	//
نقطوں کے وجود کے متعلق ایک اعتراض اور اس کا جواب	۱۲۶
نقطوں کی بحث ایک دھوکہ ہے	۱۳۳
عربی حروف کے نقطے کب ایجاد ہوئے	۱۳۶
تاریخ لغت اور اشعار جاہلیت کی روشنی میں	
محقق : جناب رحمت اللہ طارق دار الحدیث مکۃ المکرمہ	
اختلاف قرأت کا پس منظر تاریخ اور ماخذ	۱۵۶
... از جناب رحمت اللہ طارق فاضل حدیث مکہ مکرمہ ...	
مولانا مودودی اور اختلاف قرأت	
اختلافات قرأت کا پہلا مصنف	۱۶۷
حمزہ زیات	۱۶۸
ایک وضاحت	۱۷۰
اعراب القرآن	۱۷۱
ابوالاسود کا طریقہ	۱۷۳
نقاط القرآن	۱۷۵
زیادات القرآن	۱۷۸
تحبیر القرآن	۱۷۹
فضائل القرآن	۱۸۳
ناسخ منسوخ قرآن	۱۸۴
احکام القرآن	۱۸۵
غرائب القرآن	۱۸۶
قراءات قرآن	//
بلاغۃ القرآن	۱۸۹

تقدیم

از : مفتی محمد طاہر مکی

راقم نے قرأت عشرہ (شاطبیہ اور طیبہ دونوں کے طرق سے) دارالعلوم ٹانک واڑہ میں حضرت مولانا قاری فتح محمد صاحب پانی پتی سے پڑھیں۔ اگر ان کے لئے یہ کہا جائے تو یہ شاگردانہ مدح سرائی نہیں بلکہ حقیقت کا کھلا اعتراف ہوگا کہ وہ عشرہ قرأت میں نہ صرف اپنے عصر میں بلکہ غالباً امام جزری کے بعد سے آج تک بے مثل یکتا اور منفرد تھے۔

جامعہ خیر المدارس ملتان کے شعبہ قرأت کے صدر مولانا قاری رحیم بخش صاحب مرحوم نے جو ہمارے حضرت قاری صاحب کے نہ صرف قابل فخر شاگرد تھے بلکہ اس مصرعہ کا مکمل مصداق تھے ۔

وہ شاگرد رشید ایسا کہ استاذ زماں نکلا

اپنے استاد کے متعلق جو سوانحی کتابچہ لکھا تھا اس میں مدینہ منورہ کے شیخ القراء شیخ حسن الشاعر کا یہ اعتراف نقل کیا ہے کہ مدینہ منورہ کی مرکزیت کی وجہ سے مجھے تمام عالم اسلام کے اہم علماء و قراء سے رابطہ کا موقعہ ملتا رہتا ہے مگر اس فن میں نہ صرف حفظ کا بلکہ علم و تحقیق کا جو مقام حضرت قاری صاحب کا میں نے پایا وہ کسی میں نہیں پایا۔

حضرت قاری صاحب سے یہ علم اگرچہ راقم نے کم عمری میں حاصل کیا (قاری صاحب کی تدریس کا آخری دور تھا) میرے ساتھی بھی صرف ایک تھے قاری بشیر احمد صاحب تونسوی جو اس زمانہ میں قاری شریف احمد صاحب کے ہاں تدریس کا کام کرتے تھے (بعد میں مولانا سلیم اللہ خان صاحب انہیں دارالعلوم کورنگی میں شعبہ قرأت کے صدر کی حیثیت سے لے گئے تھے پھر وہ مدینہ منورہ چلے گئے اور اب تک وہیں ہیں) مگر اس فن کو میں نے جتنی محنت اور ذوق شوق سے حاصل کیا تھا اس کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ جب قاری رحیم بخش صاحب نے امام جزری کی طیبہ کا اردو ترجمہ کرنا شروع کیا تو

حضرت قاری صاحب نے مجھے خط لکھا کہ پڑھنے کے زمانہ میں تم نے طیبہ کے جوامالی مجھ سے لکھے تھے وہ مجھے بھجوا دو تاکہ قاری رحیم بخش صاحب ترجمہ و تشریح کرنے میں اس سے مدد لے سکیں۔ ظاہر ہے یہ استاد محترم کی طرف سے میری محنت پر اعتماد کا اظہار تھا۔ (میں نے اس حکم کی تعمیل کر دی تھی)

یہ تمام تمہید جس بات کے لئے باندھی تھی وہ یہ ہے کہ اس زمانہ میں بھی اور اس کے بعد بھی عربی کے ہم درس رفقاء سے جب کبھی اختلاف قرأت پر بات چل نکلتی تو میں نے دیکھا کہ کئی ذہین ساتھی اور بعض اساتذہ بھی اختلاف۔ قرأت کے متواتر ہونے پر یقین نہیں رکھتے تھے۔ ان کے دلائل کیا تھے؟ یہ تو اب یاد نہیں ہیں لیکن ان کا یہ تاثر اب تک ذہن میں اچھی طرح محفوظ ہے۔

دوران تعلیم یا اس کے بعد حضرت قاری صاحب سے اور والد محترم حضرت مولانا قاری[1] عبدالرحیم صاحب سے تو اس عنوان پر گفتگو کا کبھی موقعہ نہیں ملا، اور اگر ملتا بھی تو شاید اس عنوان پر تفصیلی گفتگو کی جرأت نہ ہوتی۔ البتہ کچھ دوسرے بزرگ اہل علم سے جب کبھی بات کرنے کا موقعہ ملا تو اندازہ ہوا کہ اکثریت تو اس فن سے شناسا ہی نہیں ہے۔ جو شناسا ہیں ان کی کیفیت وہی ہے جو ہر صاحب فن کو اپنے فن میں غلو کی ہوتی ہے۔ ظاہر ہے طالب تحقیق کا مزاج اس سے مطمئن نہیں ہو سکتا۔۔۔ البتہ کچھ

---

[1] والد صاحب اور قاری صاحب کے باہم گہرے روابط اور ایک دوسرے کے ہاں آنا جانا انڈیا کے زمانہ سے ہی تھا۔ یہی وہ قدیم تعلق تھا جس کی وجہ سے حضرت قاری صاحب نے اپنی دوسری اہلیہ محترمہ کو قرآن کی تصحیح کے لئے والدہ محترمہ (اطال اللہ بقاءہا) کے پاس مکی مسجد بھیجنا شروع کیا تھا۔

حضرت قاری صاحب کے استاد قاری محی الاسلام صاحب اور والد محترم کے استاد قاری عبداللہ صاحب ایک ہی استاد قاری عبدالرحمٰن صاحب کے شاگرد تھے بلکہ کچھ عرصہ قاری محی الاسلام صاحب نے قاری عبداللہ صاحب سے بھی پڑھا تھا۔ ان حضرات کے استاد قاری عبدالرحمٰن صاحب، قاری عبدالرحمٰن صاحب محدث پانی پتی کے شاگرد تھے۔ والد صاحب نے درس نظامی کی فراغت خیر آبادی سلسلہ کے مولانا معین الدین اجمیری سے کرنے کے بعد قرأت کی تکمیل دہلی میں کی۔ والد صاحب کی سند قرأت جو پمفلٹ کی شکل میں مطبوعہ ہے اور حادثات زمانہ سے بچ گئی ہے۔ اس پر قاری محی الاسلام صاحب اور کئی شیوخ ازہر کے جو اس زمانہ میں دہلی آئے ہوئے تھے، دستخط ہیں۔

ایسے صاحب فن بھی ملے جو صرف قاری نہیں بلکہ فن قرائت کے ساتھ دوسرے علوم پر بھی حاوی تھے۔ ان کا عمومی رجحان قرات کے عدم تواتر کی طرف تھا۔

حضرت مولانا محمد یوسف صاحب بنوری کے بڑے داماد' مولانا محمد طاسین صاحب اگرچہ اکثر علماء کی طرح فن قرائت کے ماہر نہیں تھے مگر مجلس علمی جیسی منتخب لائبریری کے نگراں اور مہتمم ہونے کے حوالہ سے بہت وسیع النظر عالم تھے' ان کا نقطہ نظر بھی یہی تھا۔

جناب مولانا حکیم نیاز احمد صاحب مولف تحقیق عمر عائشہ صدیقہؓ جو میرے استاد حضرت قاری صاحب کے ہم وطن بلکہ ہم محلہ تھے اور عربی میں ان کے استاد' اور قرائت میں ان کے شاگرد تھے' پھر دیوبند میں دونوں نے حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ سے دورۂ حدیث کیا تھا' نہ صرف قرائت کے عدم تواتر کے قائل تھے بلکہ اس عنوان پر لکھنا بھی چاہتے تھے۔ یہی نقطہ نظر علامہ انور شاہ کے شاگرد' دارالعلوم دیوبند کی مجلس شوریٰ کے رکن 'ماہنامہ برہان کے مدیر مولانا سعید احمد اکبر آبادی صدر شعبہ دینیات مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کا تھا۔

تین ندوی اہل علم مولانا عبدالقدوس ہاشمی ندوی ڈائریکٹر موتمر عالم اسلامی' امام الصوفیہ مولانا جعفر شاہ ندوی پھلواروی اور امام اہلسنت مولانا محمد اسحاق صدیقی سندیلوی ندوی سابق مفتی و مہتمم و شیخ الحدیث دارالعلوم ندوہ لکھنؤ کا نقطہ نظر بھی یہی تھا۔ ان میں سے دو موخر الذکر حضرات سبعہ کے باقاعدہ سند یافتہ قاری بھی تھے۔ مولانا سندیلوی اس عنوان پر کچھ لکھ بھی چکے تھے جو غالباً" مسودہ کی صورت میں ان کے چھوٹے بھائی صاحب کے پاس موجود بھی ہے۔ اسی سلسلہ میں مولانا نے مجھ سے امام جزری کی النشرفی قرآت العشر (دو جلد) کا نسخہ طلب فرمایا تھا اور استفادے کے بعد واپس کر دیا تھا' اس کے حاشیوں پر مولانا کے تنقیدی نوٹ دیکھ کر بھی ان کے اس نقطہ نظر کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

راقم بھی عرصہ دراز سے تاریخ و رجال پر تحقیقی کام کے ساتھ قرائت پر بھی کام کر رہا ہے۔ اگر اللہ نے چاہا تو یہ سب کام سات آٹھ مجلدات کی شکل میں منظر عام پر آئے گا' اور بات نسبتہ" زیادہ واضح ہو سکے گی۔

اس وقت تو علامہ تمنا عمادی کی پیش نظر تحقیقات کے متعلق صرف یہی گزارش کرنی ہے کہ اس کا مطالعہ کھلے دل و دماغ کے ساتھ کیا جائے۔ نہ ہر بات کی تائید ضروری ہے' نہ تردید ضروری۔ بلکہ اس

ارشاد قرآنی کے مطابق عمل کیا جائے : **فبشر عباد.....هم اولو الالباب**

(سورہ زمر نمبر۳۹ آیت نمبر۱۷، ۱۸)

مفہوم : کامیابی کی بشارت دے دو میرے ان بندوں کو جو کسی تحقیق کے سننے سے انکار نہیں کرتے البتہ اس میں جو کار آمد حصہ ہے اسی کو قبول کرتے ہیں۔ یہی لوگ ہیں جن کو اللہ نے ہدایت عطا کی اور یہی عقل و دماغ والے ہیں۔

محمد طاہر

- مفتی و مہتمم مدینتہ العلوم ٹرسٹ
- صدر قرآنی مرکز
- جنرل سیکریٹری ادارۂ فکر اسلامی
- سرپرست جمیعت تدریس القرآن
- سرپرست بزم خاتم المعصومین صلی اللہ علیہ وسلم
- سرپرست سیرت مرکز

تاثّرات بروفات
علاّمہ تمنّا عمادی مجیبی

مولانا ڈاکٹر عبداللہ عباس ندوی' ایم' اے' پی' ایچ' ڈی استاد فلسفۂ
لسانیات، ملک عبدالعزیز یونیورسٹی جدہ مشیر امور اقلیات' رابطہ عالم اسلامی
مکہ مکرمہ۔ حال ناظم تعلیمات ندوۃ العلماء لکھنؤ۔

برصغیر ہند و پاک کے ایک مقتدر عالم دین، وسیع النظر محقق اور اردو فارسی کے بلند پایہ ادیب و شاعر مولانا محی الدین تمنا[1] ۸۰ سال کی عمر میں گزشتہ ماہ وفات پائی۔

وہ صوبہ بہار کے ایک مردم خیز قصبہ پھلواری کے رہنے والے تھے' اور ایک ایسے علمی و دینی خاندان کے رکن تھے۔ جہاں کچھ اوپر دو سو سال سے علم و مشیخت کا سلسلہ قائم ہے' ان کو فارسی اور فن عروض میں ماہرانہ دستگاہ حاصل تھی۔ مولانا سید سلیمان ندوی رحمہ نے اپنے ایک مقالہ میں بہار کی باکمال شخصیتوں کا تعارف کرایا ہے' اس میں مولانا عمادی مجیبی کا تذکرہ اسی حیثیت سے کیا ہے' یہ مقالہ سید صاحب کے مجموعۂ مقالات نقوش سلیمانی میں موجود ہے۔ مولانا عمادی مجیبی بہت ہی ذہین' اعلیٰ درجہ کے طباع اور نکتہ سنج تھے؛ انھوں نے درس نظامی کی تکمیل اپنے والد اور خاندان کے دوسرے بزرگوں مولانا حکیم علی نعمت اور مولانا محمد منظور احمدؒ سے کی تھی' اور کچھ عرصہ[1] تک متوسطات کی کتابوں کا درس بھی دیا تھا' ان کے والد مولانا شاہ نذیر الحق فائز ایک وسیع الاستعداد

---

[1] خود علامہ تمنا کے ارشاد کے مطابق اور علامہ کے شاگرد مولانا اسد القادری کی تحریر کے مطابق درس و تدریس کا زمانہ چودہ پندرہ سال پر محیط ہے۔ اور اس دوران ابتدائی کتابوں سے انتہائی کتابوں تک سب کا درس دیا۔ (طاہر)

عالم تھے۔ فارسی میں فکر سخن کرتے تھے۔ ان کے کلام کا مجموعہ پروفیسر ڈاکٹر افضل امام صاحب نے مرتب کرکے شائع کیا ہے۔ مولانا عمادی کا ابتدائی تعارف بھی ایک شاعر کی حیثیت سے ہوا۔ ان کی شاعری زیادہ تر بلکہ تمام تر نعت نبوی پر مشتمل تھی۔ وہ فارسی اور اردو میں پرجوش اور پرکیف نعتیں کہتے تھے۔ نعتوں کے ضمن میں اصلاح و موعظت کے مضمون بھی بڑی خوبی سے نظم کرتے۔ ان کے شیخ طریقت اور استاد شاہ رشید الحق عمادی سجادہ نشین خانقاہ عمادیہ پٹنہ، جو ان کے آبائی رشتہ سے چچا بھی تھے۔ مولانا تمنا عمادی کو "حسان الہند" کہا کرتے تھے، چنانچہ ان کی نظموں کے ابتدائی مجموعے "حسان الہند علامہ تمنا عمادی مجیبی پھلواری" کے نام سے شائع ہوا کرتے تھے افسوس کہ ان سطور کی تحریر کے وقت ان کے اشعار کا کوئی مجموعہ نہیں ہے جو نمونہ کے طور پر پیش کیا جاسکے۔ البتہ چند متفرق اشعار جو حافظے کے گوشوں میں پراگندہ پڑے ہوئے ہیں ان کا یہاں درج کرنا نامناسب نہ ہوگا۔

حضرت جابر بن سمرہؓ کی ایک روایت شمائل ترمذی میں ہے کہ وہ ایک مرتبہ چاندنی رات میں حضور انور صلے اللہ علیہ وسلم کو یمنی چادروں میں ملبوس دیکھ رہے تھے کبھی وہ چاند کو دیکھتے اور کبھی حضور انور کو! اور کہتے کہ مجھ کو حضور انور چاند سے زیادہ خوبصورت نظر آرہے تھے اس واقعہ کو مولانا تمنا عمادیؒ نے نظم کیا تھا! اس نظم کا ایک شعر یہ ہے۔

رات بھر کیوں نہ تجھے چاند میں دیکھا ہی کروں
ان کی صورت سے بہت ملتی ہے صورت تیری

شاعری ان کے فن عروض میں ماہرانہ دستگاہ کا نتیجہ تھی۔ مگر پھر بھی اکثر اشعار سلیس اور رواں ہوتے تھے مثلاً ایک نظم کا پہلا شعر ہے۔

شیوۂ احبابؐ جدا۔ شکوۂ اغیار جدا
میرے افسانے کے ہیں دو باب، ہر ایک باب جدا

؎ یہ مصرع قافیہ مضمون لکھ کر سوتیلم نے مجھ سے کچھ بتلایا۔ شاید اس مصرع یوں ہو۔ شکوۂ غیر جدا، شکوۂ احباب جدا

ان کی شاعری کا اصلی رنگ فارسی میں کھلتا تھا، ایک مشہور زمین میں ان کے یہ دو شعر سنئے۔

حاشا کہ دل از ناوکِ جاناں گلہ دارد ٭ برباد سرائے کز مہماں گلہ دارد

دیوانہ بکار است چہ داد نہ زدستش ٭ داماں گلہ دارد کہ گریباں گلہ دارد

مولانا تمنا عمادی کے شاگردوں کی تعداد خاصی تھی جن میں بعض بہت کامیاب شعرا بھی رہے ہیں جیسے تجمل ارمان اور شفیع تمنائی پھلواروی ان کے علاوہ خاندان کے اکثر و بیشتر نوجوان جن کے اندر شاعری کی امنگ پیدا ہوئی۔ مولانا سے ہی رجوع کرتے تھے۔ مگر شعر و ادب سے دلچسپی جوانی ہی کی عمر میں کم ہو گئی تھی، علمی و تحقیقی مصروفیات نے اس ذوق پر غلبہ حاصل کر لیا تھا لیکن شعر و ادب سے وہ کلیۃً مستغنی نہیں ہوئے تھے، اپنے وسیع اور عالی شان مکان کا نام انھوں نے "دار الادب" ہی رکھا تھا جو ان کی ہجرت پاکستان کے بعد دوسروں کے قبضے میں آیا مگر اس کے دروازوں کا کتبہ اب بھی باقی ہے۔

وہ خاندانی صوفی تھے۔ تصوف کی گودوں میں پلے تھے، ان کے جدامجد (چھٹی پشت کے دادا) حضرت تاج العارفین شاہ محمد مجیب اللہ رحمۃ اللہ علیہ تھے جن کے اخلاف کی دو خانقاہیں پھلواری اور پٹنہ میں موجود ہیں۔ ان کی خانقاہوں کے "رسوم و آداب" نہ خالص دیوبندی طرز کے ہیں نہ بریلوی انداز کے، ان دونوں کے درمیان ایک معتدل اور متوسط انداز کی رسمیں وہاں رائج ہیں جن میں رسم سماع بھی شامل ہے۔ مولانا تمنا عمادی ان مروجہ مراسم تصوف سے گہرا تعلق رکھتے تھے۔ ذکر، شغل، مراقبہ، قبور سے لے کر حال قال میں کسی سے پیچھے نہیں تھے۔ لیکن کچھ عرصہ کے بعد ان مراسم سے دل برداشتہ ہو گئے بلکہ ان کے سخت مخالف ہو گئے۔ اس تبدیلی کا سبب خواہ کتاب و سنت کے مطالعہ کا خاص انداز رہا ہو یا کوئی دوسرا نفسیاتی سبب اس کا تعین دشوار ہے[1]۔ بہرحال یہ باتیں راقم الحروف

---

[1] خود علامہ تمنا کے ارشاد کے مطابق (جیسا کہ مولانا ظفر احمد عثمانی کے نام خط میں انھوں نے تحریر کیا ہے) تصوف اور اس کی رسوم سے علامہ کے بُعد کی وجہ کتاب اللہ، سیرت رسول اللہ اور سیرت اصحاب رسول اللہ کا غیر جانبدارانہ مطالعہ تھا۔ ورنہ ظاہر ہے ایک خاندانی پیر گھرانے کے فرد کے لئے صوفیانہ رسوم سے فائدے ہی فائدے تھے۔ (ظاہر)

کے وجود سے پہلے کی ہیں۔ اس لئے ان پر رائے زنی آسان نہیں ہے کہ تصوف سے انحراف و ترک کا باعث کیا تھا۔ البتہ جو چیز ہوش سنبھالنے کے بعد دیکھی اور سنی وہ یہ تھی کہ مولانا تصوف۔ خانقاہ اور خانقاہیت کے شدید منکر تھے۔ وہ اپنے گھر پر ہر جمعہ کو درس قرآن کا جلسہ کیا کرتے تھے۔ قرآن کریم سے ان کو شغف تھا، عربی لغت و نحو پر ان کو عبور کامل تھا تفسیروں پر نظر تھی۔ تصوف پر جب وہ نکیر کرتے تو کہا کرتے تھے کہ مجھے یہ الزام نہیں دیا جا سکتا کہ

ے لذت ایں بادہ ندانی بخدا تا نہ چشی

تصوف کے انکار سے ان کے اندر ایک ذہنی انقلاب پیدا ہوا۔ انھوں نے اپنی عمر میں بار بار رائے نہیں بدلی۔ یہی ایک تبدیلی تھی جو اول و آخر ہوئی مگر اس کے نتائج بہت دور رس اور بعد میں تکلیف دہ حد تک غلو کی شکل میں نمایاں ہوئے۔ پہلا نتیجہ تو یہ نکلا کہ وہ تحقیق میں تقلید سے آزاد ہو گئے[1] وہ مسائل میں تحقیق کے وقت براہ راست قرآن و احادیث اور زیادہ تر قرآن کریم سے استشہاد کرتے۔ ائمہ مجتہدین اور ان کے پیرو بزرگوں کے اقوال ان کے لئے دلیل کا درجہ نہیں رکھتے تھے۔ دوسرے الفاظ میں آپ یوں کہہ سکتے ہیں کہ وہ اپنے مقالات میں حوالے کبھی ثانوی ماخذ ———— (SECONDERY SOURCES) کے نہیں دیتے تھے۔ انکار تصوف کا دوسرا نتیجہ یہ ظاہر ہوا کہ تصوف کے "سلسلۃ الذہب" سے ان کے اندر ایک کد پیدا ہو گئی اور مناظرانہ جوش میں وہ حضرت سیدنا علی کرم اللہ وجہہ اور خاندان رسالت کے افراد پر اس طرح تنقید کرتے جس طرح شیعہ سنی مناظرہ کرنے والے بعض اہل سنت علماء کرتے ہیں بلکہ ان سے بھی دو قدم آگے۔[2]

[1] یہ نتیجہ تو بہت مبارک تھا اسے "تکلیف دہ حد تک غلو" کہنا بڑی زیادتی ہے۔ تحقیق حق میں اگر کوئی شخص اپنے خاندانی یا علمی اکابر یا فرقہ کی تقلید سے آزاد نہ ہو تو وہ تحقیق کر ہی نہیں سکتا۔ (طاہر)

[2] علامہ تمنا خود محترم مقالہ نگار کے ارشاد کے مطابق حضرت فاطمہؓ کی اولاد سے تھے یعنی ہندی محاورہ کے مطابق سید تھے لہذا حضرت علیؓ اور حضرت حسینؓ ان کے جد امجد تھے۔ پھر صحابی تھے اور علامہ کا مسلک تو از اول تا آخر اسوۂ صحابہ کی تعمیل تھا جسے وہ قرآنی اصطلاح میں سبیل المؤمنین کہا کرتے تھے اور اس عنوان پر انھوں نے باقاعدہ ایک کتاب بھی لکھی ہے۔ لہذا اگر وہ صحابہ کرام کی اکثریت کے مقابلہ میں اپنے اجداد کی ایک آدھ خطاء اجتہادی کا اعتراف کرتے تھے تو یہ تو ان کی حق شناسی کا بہت بڑا ثبوت ہے نہ کہ "تکلیف دہ حد تک غلو" کا

غالباً یہی رگ تھی جس نے ان کے قلم سے محمود عباسی کے ان خرافات کی بھی تائید کرا دی۔ جن پر تحقیق کا لیبل علم پر ایک بدترین تہمت[1] ہے جس میں کھلا دجل، عبارتوں کی قطع و برید، غلط انتساب سب کچھ ہے۔

وہ حدیث کے منکر نہیں تھے۔ یہ ان پر اتہام ہے۔ وہ نام نہاد اہل قرآن کی طرح علم حدیث سے کورے نہیں تھے۔ بلکہ رجال احادیث پر ان کا اتنا بڑا کام ہے جس کی نظیر بہت سے شیخ الحدیثوں کے یہاں نہیں مل سکتی، وہ صرف یہ کہا کرتے تھے کہ حدیثیں قرآن کی ناسخ نہیں ہو سکتیں اور جو حدیثیں نص قرآن سے متعارض ہیں وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثیں نہیں ہو سکتیں۔ مگر ہند و پاک کے اس گروہ نے جو اپنے آپ کو اہل قرآن کہتا ہے، مولانا کی تحریروں سے خوب خوب فائدہ اٹھایا۔ احادیث کے متون اور رجال سند کی بحثیں جن کا جائزہ لینا ان کے بس میں نہ تھا۔ اس کام کو مولانا عمادی انجام دیا کرتے تھے اس میں ان کی تائید کے پہلو مل جاتے، اُس کو اجاگر کر کے پیش کرتے، اس طبقہ کے اس طرز عمل نے مولانا کو کئی نقصان پہنچائے۔ ایک طرف تو مدارس کے علماء نے ان کو بھی

(بقیہ ص۱۲ کا حاشیہ) اگر ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ۔ حواری رسول حضرت زبیرؓ اور حضرت معاویہؓ اور حضرت عمرو بن العاصؓ کی خطاء اجتہادی پر زور دینا اور اس کا پروپیگنڈہ کرنا بلکہ اسے عقیدہ بنا لینا جرم نہیں ہے تو حضرت علیؓ و حضرت حسینؓ کی کسی خطاء اجتہادی کا قائل ہونا جرم کیوں ہو؟ کیا ام المؤمنین حضرت عائشہؓ صدیقہ اور حواری رسول حضرت زبیرؓ کی خطائے اجتہادی کا تذکرہ کرنے والے بھی "تکلیف دہ حد تک غلو" کے مرتکب کہلائیں گے یا ان کے خطاء اجتہادی کا تذکرہ کرنا جرم نہیں ہے؟ حضرت! اگر اصول ہو تو سب کے لئے یکساں ہونا چاہئے۔ ورنہ صحابہ کرام میں سے کچھ کے لئے معیار جدا ہو اور کچھ دوسروں کے لئے جدا معیار ہو یہ طرز عمل اصول اور عدل کے خلاف ہے اور فی الحقیقت "تکلیف دہ حد تک غلو" یہ طرز عمل ہے نہ کہ علامہ تمنا کی اصول پسندی جس کی وجہ سے تمام صحابہ کرام کو ایک نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ (طاہر)

[1] محترم مقالہ نگار کا یہ فیصلہ بھی انتہا پسندانہ ہے۔ عباسی مرحوم کی یہ کتاب نہ اس قدر بری ہے جیسا کہ مقالہ نگار کا ارشاد ہے۔ نہ ایسی غیر معمولی جیسا کہ اس کتاب کے معتقدین سمجھتے ہیں۔ اگر محترم مقالہ نگار اس کتاب کو اس حد تک بدترین سمجھتے ہیں تو انھیں کسی مختصر مقالہ ہی میں سہی اس کتاب کی علمی تنقید کرنی چاہئے تھی۔ جذباتی انداز کے الزامات نامناسب ہیں۔

پرویز جیسا ہی عالم سمجھ لیا اس لئے ان کی باتوں کو قابل توجہ نہیں سمجھا اور کبھی ان کا نام بھی لیا تو اسی انداز سے جس طرح پرویز صاحب کا نام تحقیر و استخفاف کے ساتھ علمی و دینی حلقوں میں لیا جاتا ہے۔

"دوسری طرف ان محمود عباسیوں، پرویزیوں اور اہل قرآنوں نے مولانا تمنا کی مکمل بات سامنے نہیں آنے دی۔ چند ماہ پہلے ماہنامہ فاران میں مولانا تمنا کا ایک مضمون شائع ہوا تھا جس میں انھوں نے اس مظلومیت کا اظہار کیا تھا۔

عالم باعمل | بہرحال اپنے "موتی" کا ذکر کرنا چاہئے۔ ان کی خاص بات جس کی شہادت ان کے انتقال کے بعد دی جا سکتی ہے اور جس کی شہادت میں صرف اللہ تعالیٰ کی رضا مقصود ہے وہ یہ ہے کہ وہ مخلص اور سچے مسلمان تھے، انھوں نے جو کچھ لکھا اور کہا وہ ان کے ضمیر کی آواز تھی اور ان کی تحقیق کا نتیجہ تھا۔ انھوں نے اپنے نظریہ کے تحت (کسی رعایت کے لئے نہیں) اپنا جما جمایا گھر، نیک نامی اور عزت کی زندگی، خوشحالی اور فارغ البالی کی معیشت کو چھوڑ کر ـــــ مشرقی پاکستان میں ہجرت کی۔ اپنے اعزہ اور خاندان کے افراد جن کی بے پناہ محبت ان کے دل میں تھی اور جن کے نازک سے نازک جذبات کا وہ احترام کرتے تھے، ان سب کی بے رخی مول لی۔ ان کے اخلاص و صداقت کا ایک نمونہ یہ ہے کہ انھوں نے اپنی دو بیٹیوں کی شادی ایسے خاندان میں کر دی جس کو بہار کی ہندوانہ معاشرت سے متاثر مسلم معاشرہ نسبی اعتبار سے پست سمجھتا تھا، اور خاص طور سے "پھلواری" کے مشائخ کا خاندان جو اس کو "ناک کٹانے" کے مرادف سمجھتا تھا، وہاں انھوں نے کسی تنقید کی پرواہ نہ کی، یہ کوئی معمولی بات نہ تھی۔ یہ اقدام وہی کر سکتا تھا جس کو اپنے عقائد پر اطمینان کامل ہو، یوں وعظ کہنا اور مضمون لکھ دینا آسان ہے مگر عملی اقدام وہی کر سکتے ہیں جو اولوالعزم ہوں!

ان کا دوسرا وصف یہ تھا کہ وہ عمر بھر ایک نہ تھکنے والے محنتی طالب علم رہے۔ اپنے ہوش سنبھالنے سے لے کر بستر مرگ تک جبکہ ان کو اپنی موت صاف نظر آ رہی تھی علمی تحقیق و جستجو میں مصروف رہے، راقم الحروف کے پاس ان کا آخری خط نومبر کی کسی تاریخ کا ہے انتقال سے

دس پندرہ روز پہلے لکھا تھا۔ اس کی ابتدا اس طرح کی تھی کہ یہ خط اپنے بستر مرگ سے لکھ رہا ہوں۔ اس خط میں بھی قرآن کریم کے چند الفاظ اور ان کی تعبیر پر تحقیقات کا تسلسل [illegible] ان کے اس خط کو پڑھ کر مجھے ایک بزرگ عالم کا واقعہ یاد آیا کہ انھوں نے اپنے آخری لمحات زندگی میں کسی سے فرائض کے ایک مسئلہ کو دریافت کیا۔ لوگوں نے کہا کہ یہ آپ کا آخری وقت ہے اس وقت آپ یہ معلوم کرکے کیا کریں گے۔ انھوں نے جواب دیا کہ اس شے سے واقف ہوکر مرنا زیادہ بہتر ہے بہ نسبت اس کے کہ جاہل رہ کر مروں۔

مولانا تمنا عمادی مجیبی ۱۳۰۶ھ میں ایک کھاتے پیتے گھرانے میں پیدا ہوئے اور ۱۳۹۲ھ میں کراچی میں مسافرانہ بیکسی کی حالت میں فوت ہوئے۔ حق تعالیٰ ان کو شریک رحمت و مغفرت کے لئے بہانہ ڈھونڈتی ہے ان کو بخش دے۔ آمین

(ماہنامہ فاران کراچی، مارچ ۱۹۷۲ء، ص ۹)

دیگر اہلِ علم کے تأثرات

۲۔ مولانا اسد القادری

گل کہوں، بلبل کہوں، گلشن کہوں یا باغباں
تو سبھی کچھ ہے کہوں میں کیا تجھے اے جانِ جاں

مفسّر، محدث، فقیہ، ادیب و شاعر، جامع العلوم وحید العصر، مولانا تمنا عمادی مجیبی کی شخصیت اس قدر جامع الکمالات، جامع الحیثیات اور جامع الجہات ہے کہ فی الحقیقت اپنی مثال نہیں رکھتی۔

چودہ سال تک بخاری و مسلم، بیضاوی و کشاف اور حماسہ و متنبی جیسی کتابیں پڑھاتے رہے، میرزاہد، ملا جلال اور صدرا وغیرہ فلسفہ و منطق کی معرکۃ الآرا کتابوں پر اس قدر بلند پایہ حواشی و شروح لکھیں کہ اکابر علماء نے قدر کی نگاہوں سے دیکھا، دیوان امرأ القیس و مقامات کی شرح لکھی، عربی صرف و نحو پر محققانہ کتاب لکھی، اردو، فارسی اور عربی گرامر پر ایسا عبور شاید ہی کسی کو حاصل ہو۔ علم عروض و قوافی میں امام وقت تفسیر و تنقید احادیث میں وسیع النظر ماہر۔ قرآن مجید کے مشہور مفسر، پھر عربی، فارسی، اردو شاعری میں استادانہ مہارت رکھنے والا اگر صرف ایک آدمی ڈھونڈیں تو حضرت استاد ممدوح کے سوا اور کوئی ہند و پاک کی وسیع آبادی میں آپ کو نہ ملے گا۔ شاعر کے الفاظ میں۔ ؎

آپ بے بہرہ ہیں جو معتقدِ میر نہیں

۳۔ فراہی مکتب فکر کے مولانا جاوید الغامدی۔ (مدیر ماہنامہ اشراق لاہور)
علامہ تمنا کی تحقیقات سے میں نے بہت استفادہ کیا ہے۔

۴۔ مولانا حبیب الرحمن کاندھلوی

فن اسماء الرجال پر علامہ تمنا کو جو عبور ہے اس کے پیش نظر ان کے سامنے میں خود کو طفل مکتب سمجھتا ہوں۔

۵۔ مولانا افتخار احمد بلخی

مصنف "فتنۂ انکار حدیث کا پس منظر و پیش منظر" جسے جماعت اسلامی کے پروفیسر خورشید احمد نے اپنے مکتب چراغ راہ کراچی سے شائع کیا ہے۔ بلخی صاحب علامہ مرحوم کے شاگرد تھے۔ انھوں نے اپنی اس کتاب کے حصہ سوم میں جگہ جگہ علامہ تمنا کے تبحر علمی اور حجیت حدیث کے قائل ہونے کا اعتراف کیا ہے۔

۶۔ مولانا جعفر شاہ پھلواروی

جو حضرت شاہ سلیمان پھلواروی کے چھوٹے صاحبزادے ہیں، کپورتھلہ کی جامع مسجد کے خطیب تھے جہاں سر سلطان محمد آغا خان نے بھی ان کے پیچھے نماز ادا کی۔ جماعت اسلامی کے بانی اراکین میں سے تھے۔ پاکستان پہنچنے کے بعد ادارۂ ثقافت اسلامیہ لاہور کے مقبول ترین مصنف تھے ۔۔۔ مولانا جعفر شاہ صاحب نے علامہ تمنا سے بہت استفادہ کیا ہے۔ علامہ کے سوانح نگار جناب انیس الرحمن ایڈوکیٹ نے مولانا جعفر شاہ کو علامہ مرحوم کے شاگردوں میں شمار کیا ہے۔
مولانا جعفر کہا کرتے تھے کہ مجھے پیر پرستی اور اکابر پرستی کی دلدل سے نکال کر سبیل المؤمنین (راہِ صحابہؓ) پر ڈالنے والے علامہ تمنا ہیں۔ ان جیسا جامع العلوم شخص میری نظر سے نہیں گذرا۔

۷۔ مبلغ اسلام پروفیسر یوسف سلیم چشتی کا اعتراف۔

شارح اقبال اور علامہ اقبال کے قائم کردہ تبلیغی کالج لاہور کے پرنسپل (جہاں سے قاضی مظہر حسین وغیرہ فضلاء دیوبند نے تبلیغ کی تربیت حاصل کی)

کہتے ہیں کہ : قرآن کریم اور قدیم فلسفہ پر علامہ تمنا کو جو عبور حاصل ہے اس کی مثال نہیں ملتی۔ فلسفہ کی قدیم کتابوں اور شیخ اکبر ابن عربی کی فتوحات مکیہ و فصوص الحکم پر گفتگو کرتے ہوئے وہ ان کے صفحوں کے صفحے زبانی سناتے چلے جاتے ہیں۔

۸۔ مولانا ابوالاعلیٰ مودودی۔

علامہ تمنا کے بڑے صاحبزادے مولانا امام الدین فائق۔ جماعت اسلامی کے تاسیسی رکن تھے۔ مودودی صاحب نے ان سے ملاقات کے موقعہ پر کہا کہ آپ کے والد اپنے مجتہدانہ ذوق اور علمی تبحر کے اعتبار سے برصغیر کے امام ابن حزم ہیں۔

۹۔ مولانا اسدالرحمٰن قدسی بھوپالی

جو عالم ہونے کے ساتھ مُرشد طریقت بھی تھے۔ کہا کرتے تھے کہ تصوف پر جس قدر فنی عبور علامہ تمنا کو حاصل ہے، اتنا ان کے کسی ہم عصر کو حاصل نہیں ہے میں تصوف کا مسند نشین ہونے کے باوجود ان کی تصوف پر تنقیدات کو نہایت قدر کی نگاہ سے دیکھتا ہوں۔

۱۰۔ حکیم الامت علامہ اقبال

کی فرمائش پر جب علامہ تمنا عمادی نے انتظار مہدی و مسیح کی روایات پر فن اسماء الرجال کی رُو سے تنقید کی تو علامہ اقبال بہت متاثر ہوئے اور قادیانیت کے خلاف اپنے انگریزی مضامین میں انتظار مہدی و مسیح کے عقیدے کو غیر اسلامی اور مجوسی تصور قرار دیا۔ مولانا عرشی امرتسری سے (جن کی وساطت سے علامہ اقبال نے ان روایات پر تبصرے کی علامہ تمنا سے فرمائش کی تھی) اپنے تاثر کا ان الفاظ میں اظہار فرمایا کہ میرا خیال ہے علامہ ابن حجر عسقلانی کے بعد سے (جس کو عرصہ چھ سو سال کا ہوتا ہے) اتنا بڑا ماہر فن اسماء الرجال کوئی عالم نہیں ہوا جیسا کہ علامہ تمنا عمادی ہیں۔

۱۱۔ حضرت شاہ سلیمان پھلواروی۔

جن کا احترام سرسید اور علامہ اقبال بھی کرتے تھے۔ سرسید نے اپنے رسالہ تہذیب الاخلاق

میں ان کی تقاریر شائع کی ہیں اور علامہ اقبال نے استفادہ کے لئے شاہ صاحب کو جو خط لکھا تھا وہ شاہ صاحب کے مجموعۂ مکاتیب میں شائع ہو چکا ہے۔ شاہ صاحب علامہ تمنا کے رشتہ دار تھے اور ان سے مختلف مباحث پر تحریری و تقریری مذاکرے بھی ہوتے رہتے تھے۔ مولانا جعفر شاہ کی روایت کے مطابق ان کے والد محترم نے علامہ تمنا کی مہارتِ حدیث پر تبصرہ کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ اگر دس شیوخ حدیث کی مہارت فن یکجا کی جائے تو ایک مولانا تمنا بنتے ہیں۔

۱۲۔ خواجہ احمد امرتسری۔

(علامہ اقبال کے وہ ممدوح جن کی وفات پر علامہ نے فرمایا تھا کہ " ایسے عالم باعمل روز روز پیدا نہیں ہوتے"۔ اور صوفی تبسم کے نام خطوط میں علامہ نے فقہ کی جدید تدوین کی فرمائش بھی انہیں سے کی تھی) خواجہ صاحب نے ایک مرتبہ علامہ تمنا سے یہ سوال کیا کہ دو سجدوں کا قرآن مجید میں کہیں ذکر ہے؟ تو علامہ تمنا نے جواب دیا کہ جی ہاں ایک تو سجدۂ عبودیت کا حکم ہے (فَاسْجُدُوْا لِلّٰهِ وَاعْبُدُوْا۔ سورۂ نجم ۶۲/۵۳) اور دوسرے سجدۂ قربت کا (وَاسْجُدْ وَاقْتَرِبْ سورۂ علق ۹۶/۱۹) خواجہ صاحب یہ استدلال سن کر جھوم گئے اور فرمایا بلاشبہ جیسا سنا تھا ویسا ہی پایا۔ واقعی اللہ تعالیٰ نے آپ کو بے نظیر ذہانت سے نوازا ہے۔

۱۳۔ حضرت علامہ سید سلیمان ندوی

علامہ تمنا عمادی کی مثنوی "مذہب و عقل" پر تقریظ لکھتے ہوئے سید صاحب لکھتے ہیں:۔

محب گرامی مولانا تمنا عمادی کی مثنوی "مذہب و عقل" پوری پڑھی۔ یہ مثنوی اپنی زبان کی شیرینی، نظم کی لطافت، طرزِ ادا کی دلکشی، معانی کی بلندی۔ اور خیالات کی صحت کے لحاظ سے بے حد قابل داد ہے۔ "مذہب و عقل" کی معرکہ آرائیوں کے انسداد کے لیے شاعر کے قلم نے مصالحت کی جو دفعات مرتب کی ہیں ہر دیندار ذی عقل کو

ان سے حرف حرف اتفاق ہوگا۔ فَبِاَیِّ حَدِیْثٍ بَعْدَہٗ یُؤْمِنُوْنَ ط

۱۴۔ حضرت علامہ آزاد سبحانی

حسان الہند جناب مولانا تمنا پھلواروی مدظلہٗ کی یہ کتاب خود ان کی زبانی پوری پوری، پورے غور د خوض سے سنی اور اس رائے پر پہنچا کہ یہ کتاب اپنے موضوع اپنے مسائل، اپنے دلائل، اپنی زبان، اپنے طرز بیان، ان تمام اعتبارات سے اور سب سے زیادہ اپنی روح حقیقت کے لحاظ سے ایک نادر کرشمۂ فکر اور بہترین آفادۂ عقل ہے۔

اس سے اہلِ دین اور اہلِ عقل دونوں کافی فائدہ اُٹھائیں گے، نیز مناظرہ بین الدین والعقل کا ایک بہترین قول فیصل جمہور کے ہاتھ آجائے گا۔

مگر افسوس کہ اس کا آفادہ فارسی داں طبقہ تک محدود رہے گا۔ کیا اچھا ہو اگر یہ روح حقیقت اردو قالب میں بھی جلوہ گر ہو کہ اردو دانوں کی وسیع دنیا بھی اس کی جلوہ آرائیوں سے مستفید ہو سکے، میری یہ مخلصانہ دعا ہے کہ یہ کتاب اپنے شایانِ شان قبولیت حاصل کرے۔ آمین

حفاظتِ قرآن کریم کے خلاف ایک اہم محاذ ــ محاذِ قرأت

(۱) نقطوں اور حرکات کی ایجاد کے نام پر فتنہ پردازی

کئی سال پہلے مودودی صاحب سے کسی نے پوچھا تھا کہ دجال کے متعلق مختلف و متضاد روایتیں ہیں۔ کسی میں ہے کہ دجال فلاں جگہ سے خروج کرے گا کسی میں کسی دوسری جگہ کا ذکر ہے۔ وغیر ذالک۔ مودودی صاحب نے اس کا جواب دیا کہ اصل یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو صرف اس کی خبر دی گئی تھی کہ دجال آئے گا۔ اس لئے دجال کا آنا صحیح ہے۔ اسی لئے ہر روایت میں دجال کا خروج قدر مشترک ہے۔ باقی رہا کہاں سے خروج کرے گا۔ یہ آپ کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے بتایا نہیں گیا تھا۔ شروع شروع میں آپ کا خیال تھا کہ شاید فلاں جگہ سے خروج کرے تو آپ نے ایک وقت میں اپنے گمان غالب کی بناء پر اس جگہ کا ذکر فرمایا۔ کچھ دن کے بعد آپ کا خیال بدل گیا اور آپ کا قیاس ایک دوسری جگہ کی طرف گیا تو اب کی بار آپ نے دوسری جگہ کا نام بتادیا۔ اسی طرح خیال بدلتا گیا اور قیاس بھی بدلتا گیا۔ اس کے مطابق آپ نے جگہ کا نام بھی بدل بدل کر بتایا۔ اس لئے صرف مقام خروج میں اختلاف ہوتا گیا۔

میں نے اس کے متعلق اسی زمانے میں رسالہ "البیان" امرتسر میں شائع کرادیا تھا کہ مودودی صاحب نے یہ اچھا کیا۔ محدثین پر الزام دیتے روایان حدیث کے متعلق کچھ کہتے تو سارے روایات پرست بگڑ جاتے۔

اگر سرے سے دجال کے خروج ہی سے انکار کردیتے اور ان اختلافات کی بناء پر ان سب حدیثوں کو موضوع کہہ دیتے تو مقلد و غیر مقلد سب اہل کرم مل کر کفر کا فتویٰ صادر کردیتے۔ اس لئے میرے دوست نے سارا الزام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر رکھ دیا کہ امت کو اختلافات کی کشمکش میں خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ڈالا ۔ نعوذ باللہ من ذالک ۔ حالانکہ یہ صفت تو کفار و مشرکین کی بیان کی گئی ہے کہ ان **یتبعون الا الظن و ان هم الایخرصون**[(۶۶:۱۰)] یعنی یہ لوگ صرف گمان ہی کے پیچھے چلتے ہیں اور صرف اٹکل ہی لگایا کرتے ہیں ۔ کوئی رسول کوئی نبی ایسا کب کرسکتا ہے ۔ آپ کو تو حکم تھا **لا تقف ما لیس لک به علم**[(۳۶:۱۷)] جس بات کا تم کو علم نہ ہو اس کے پیچھے نہ پڑو۔ جب مقام خروج آپ کو بتایا ہی نہیں گیا تو آپ کو اس کے متعلق کوئی علم ہی نہ تھا کیونکہ آپ کے پاس علم کا ذریعہ صرف وحی تھا۔ تو جب کوئی وحی اس کے متعلق نہیں آئی یہاں تک کہ القاء کے ذریعے، خواب کے ذریعے بھی نہیں بتایا گیا تو آپ کیوں محض اٹکل اور قیاس سے ایک ایسی بات دینی عقیدے کے متعلق بیان کرتے جس کے متعلق آپ کے پاس معلومات حاصل کرنے کا کوئی ذریعہ نہ تھا؟

ابھی کسی صاحب نے مودودی صاحب کے ترجمان القرآن جلد ۵۲ عدد ۳ (بابت جون ۱۹۵۹ء) کے چند اوراق میرے پاس بھیج کر مجھ سے اس سوال و جواب کے متعلق میری رائے پوچھی ہے جو ان اوراق میں درج ہیں۔ سائل کا نام سوال کے نیچے یا اوپر درج نہیں ۔ مگر جواب ضرور مودودی صاحب کی طرف سے ہے۔ کیونکہ فہرست مضامین میں مجیب کا نام سید ابوالاعلیٰ مودودی دیا ہوا ہے۔ سوال کا خلاصہ یہ ہے:

قرآن مجید میں قرآتوں کا اختلاف

قرآن مجید کے متعلق ایک طرف تو یہ کہا جاتا ہے کہ یہ بعینہ اسی صورت میں موجود ہے جس صورت میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر اترا تھا۔ ایک شوشے ایک نقطے کا بھی فرق نہیں ہے۔ دوسری طرف معتبر کتابوں میں نقطوں، اعرابوں، لفظوں اور جملوں تک کی کمی بیشی نظر آتی ہے جو روایت کے ذریعے بیان کی گئی ہے۔ ان روایتوں سے جو اختلاف قرآت کے نام سے مشہور ہیں، الفاظ ہی میں نہیں معانی میں بھی اختلاف پیدا ہوجاتا ہے۔ یقیناً منزل من اللہ تو ایک ہی قرآت ہوگی باقی قرآتیں ضرور غلط ہوں گی۔ سب کو کس طرح صحیح مان لیا جائے۔ وغیر ذالک۔ غرض سائل کے سوال کا یہی ماحصل ہے۔

آخر میں سائل نے یہ بھی ظاہر کیا ہے کہ "منکرین حدیث کی طرف میرا ذرہ برابر بھی میلان نہیں ہے۔"

تمنا عرض کرتا ہے کہ یہ حقیر ناقد بھی منکر حدیث نبوی نہیں ہے۔ جو حدیث محدثین کے متفقہ اصول کے مطابق صحیح ثابت ہو اس حدیث کو میں واجب الاتباع سمجھتا ہوں۔ البتہ جامعین احادیث رحمہ اللہ کی مجلدات میں جتنی حدیثیں مسطور ہیں سب کو قرآن مجید کے ساتھ مثلہٗ معہٗ نہیں مانتا، نہ راویوں کو جبریل سمجھتا ہوں اور نہ مرویات کو آیات منزل من اللہ۔ اور میرے دین میں تقیہ وکتمان جائز نہیں ہے۔ اس لئے میں اپنا عقیدہ کبھی چھپاتا نہیں۔ اور ان المنافقین فی الدرک الاسفل من النار پر (۴: ۱۴۵) میرا ایمان ہے۔ اتنا گذارش کرکے تنقید شروع کرتا ہوں۔

مودودی صاحب فرماتے ہیں۔

" یہ بات اپنی جگہ پر بالکل صحیح ہے کہ قرآن مجید آج ٹھیک اسی صورت میں موجود ہے جس میں وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوا تھا اور اس میں ذرہ برابر کوئی تبدیلی نہیں ہوئی ہے۔"

اس اعتراف کے بعد ارشاد ہوتا ہے۔

" لیکن یہ بات بھی اس کے ساتھ قطعی صحیح ہے کہ قرآن میں قرآتوں کا اختلاف تھا اور ہے۔ جن لوگوں نے اس مسئلے کا باقاعدہ علمی طریقہ پر مطالعہ نہیں کیا ہے وہ محض سطحی نظر سے دیکھ کر بے تکلف فیصلہ کر دیتے ہیں کہ یہ دونوں باتیں باہم متضاد ہیں اور ان میں سے لازماً کوئی ایک ہی بات صحیح ہے۔"

معلوم نہیں کہ " باقاعدہ علمی طریقہ " کون سا ہے جس کا مطالعہ کرنے سے دو متضاد چیزیں باہم متفق بلکہ متحد نظر آتی ہیں۔ وہ " باقاعدہ علمی طریقہ " تو مجھ کو معلوم نہیں۔ باقی رہی سطحی نظر یا گہری نظر تو اس کا فیصلہ میری تنقید کو دیکھ کر اہل علم واہل دیانت والصاف خود فرمالیں گے کہ مودودی صاحب کا جواب محض سطحی مقلدانہ غیر محققانہ ہے یا میری تنقید؟ کچھ آگے چل کر فرمایا جاتا ہے۔

" حالانکہ فیصلہ صادر کرنے سے پہلے یہ لوگ علم حاصل کرنے کی کوشش کریں تو خود بھی غلط فہمی سے بچ جائیں اور دوسروں کو غلط فہمیوں میں مبتلا کرنے کا وبال بھی اپنے سر نہ لیں۔"

بے شک۔ اس وقت حسب الحکم علم ہی حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ اس کے بعد خود فیصلہ نہیں کروں گا بلکہ ایماندار ناظرین پر فیصلہ چھوڑ دونگا۔

ارشاد فرمایا گیا ہے۔ "یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ جس رسم الخط میں ابتداءً نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے وحی کی کتابت کرائی تھی اور جس میں حضرت ابو بکرؓ نے پہلا مصحف مرتب کرایا اور حضرت عثمانؓ نے جس کی نقل بعد میں شائع کرائی۔ اس کے اندر نہ صرف یہ کہ اعراب نہ تھے بلکہ نقطے بھی نہ تھے۔ کیونکہ اس وقت تک یہ علامت ایجاد نہیں ہوئی تھیں۔ اس رسم الخط میں پورے قرآن کی عبارت یوں لکھی گئی تھی۔ کاٮ احکم امه ںحلٮ مں لدں حکىم حىر۔ اس طرز تحریر کی عبارتوں کو اہل زبان الکل سے پڑھ لیتے تھے اور بہرحال با معنیٰ بناکر ہی پڑھا کرتے تھے۔ لیکن جہاں مفہوم کے اعتبار سے متشابہ الفاظ آجاتے یا زبان کے قواعد و محاورہ کی رو سے ایک لفظ کے کئی تلفظ یا اعراب ممکن ہوتے وہاں خود اہل زبان کو بکثرت التباسات پیش آجاتے تھے۔ اور یہ تعین کرنا مشکل ہوجاتا تھا کہ لکھنے والے کا اصل منشاء کیا ہے۔ مثلاً ایک فقرہ یوں لکھا گیا ہو کہ ربںا بعد ںىں اسفارںا کو ربنا بٰعد بین اسفارنا بھی پڑھا جاسکتا تھا اور ربنا بعد بین اسفارنا بھی۔" (اسی طرح کی ایک دوسری مثال اور بھی دی ہے اس کے بعد لکھتے ہیں)

"یہ اختلافات تو اس رسم الخط کے پڑھنے میں اہل زبان کے درمیان ہوسکتے تھے لیکن ایک عربی تحریر اگر اسی رسم الخط میں غیر اہل زبان کو پڑھنی پڑ جاتی تو وہ اس میں ایسی سخت غلطیاں کرجاتے جو قائل کے منشاء

کے بالکل برعکس معنیٰ دیتی تھیں۔" (جس کی ایک مثال دی ہے اس کے بعد مودودی صاحب تحریر فرماتے ہیں)

"پھر یہ بھی ایک تاریخی حقیقت ہے کہ قرآن میں اعراب لگانے کی ضرورت سب سے پہلے بصرے کے گورنر زیاد نے محسوس کی جو ۴۵ھ سے ۵۳ھ تک وہاں کا گورنر رہا تھا۔ اس نے ابو الاسود دولی[۱] سے فرمائش کی کہ وہ اعراب کے لئے علامات تجویز کریں اور انہوں نے یہ تجویز کیا کہ مفتوح حرف کے اوپر مکسور حرف کے نیچے اور مضموم حرف کے بیچ میں ایک ایک نقطہ لگا دیا جائے۔

اس کے بعد عبدالملک بن مروان (۶۵ھ سے ۸۶ھ) کے عہد حکومت میں حجاج بن یوسف والی عراق نے دو علماء[۲] کو اس کام پر مامور کیا کہ وہ قرآن کے متشابہ حروف میں تمیز کرنے کی کوئی صورت تجویز کریں۔

---

(۱) ابوالاسود نے اپنی سمجھ اور اپنی واقفیت کے مطابق بغیر کسی معتمد علیہ جماعت کے مشورے اور استصواب کے اعراب لگائے۔ یہ بصرہ کے رہنے والے اور یہاں کے قاضی بھی تھے اور شیعہ تھے۔ ابن حجر نے تہذیب التہذیب جلد ۱۲ صفحہ ۱۰ میں ان کا ذکر کیا ہے مگر یہ نہیں لکھا ہے کہ انہوں نے قرآن مجید پر اعراب لگائے تھے یہ بھی لکھا ہے کہ استیعاب میں ان کا ذکر ہے مگر استیعاب مطبوعہ حیدرآباد دکن میں ان کا کہیں ذکر نہیں۔ ان کا نام "ظالم" تھا جیسا کہ ابن حجر نے لکھا ہے۔

(۲) وہ دو علماء کون تھے ؟ کچھ معلوم نہیں۔ اتنا بڑا اہم کام جو پہلے پہل کیا جائے اور ایسے گمناموں کے سپرد کیا گیا جن کو کوئی جانتا بھی نہیں کہ وہ کون تھے ؟ ادھر تنہا ابوالاسود اعراب لگائیں اور ادھر دو گمنام عالم پہلے پہل قرآن پر نقطے لگائیں۔ اپنے زمانے کے اکابر علماء اور مشاہیر ائمہ دین سے کوئی صلاح مشورہ نہ ابوالاسود نے لیا نہ ان دونوں نے لیا۔ دکھلانے کیلئے تو ان روایتوں سے بظاہر (قرآن مجید کی لاہمیت اور صحت ثابت کی گئی مگر بباطن غور کرنے والے کو قرآن مجید کی صحت کی طرف سے پوری طرح مشتبہ ہوجانے کا سامان کردیا۔ واقعی ان تاریخی حقیقتوں کے گھڑنے والے اپنے فن کے بڑے ماہر تھے۔

چنانچہ انہوں نے پہلی مرتبہ عربی زبان کے حروف میں بعض کو منقوط بعض کو غیر منقوط کر کے اور منقوط کے اوپر یا نیچے ایک سے لے کر تین تک نقطے لگاکر فرق پیدا کیا اور ابو الاسود کے طریقے کو بدل کر اعراب کے لئے نقطوں کے بجائے زیر، زبر، پیش کی وہ حرکات تجویز کیں جو آج مستعمل ہیں۔"

مودودی صاحب نے " باقاعدہ علمی طریقے " پر یہ " عالمانہ تحقیق " جواب دیا ہے اور اس کے بعد ہی ان دو تاریخی حقیقتوں کو نگاہ میں رکھ کر دیکھنے کی فرمائش کی ہے مگر مودودی صاحب یا ان ہی قسم کے اگلے مصنفین کے صرف اپنی کتابوں میں لکھ دینے سے تو کوئی خلاف عقل بات " تاریخی حقیقت " نہیں بن سکتی جو بات سراسر بے حقیقت ہو وہ " تاریخی حقیقت " کس طرح بن سکتی ہے ۔ جو چیز آنکھوں میں کھٹکنے لگے وہ نگاہوں میں کس طرح رکھ لی جائے؟ مودودی صاحب کو اور ان " تاریخی حقیقتوں" کے اپنی کتابوں میں درج کرنیوالوں کو کچھ تو سوچنا تھا کہ " یہ حقیقتیں " واقعی کچھ حقیقت رکھتی بھی ہیں یا نہیں ؟ کیا روایت پرستی اس طرح عقل کو اندھا کر دیتی ہے کہ بدیہی سے بدیہی بات بھی روایت پرستوں کو سوجھتی نہیں ہے؟ ہر صاحب عقل و ایمان سے میری التجاء ہے کہ اللہ کی رضا کے لئے ذرا غور کیجئے۔ ب ۔ ت ۔ ث ۔ ج ۔ خ۔ د۔ ذ۔ ر۔ ز۔ س۔ ش۔ ص۔ ض۔ ط ۔ ظ ۔ ع ۔ غ۔ ف ۔ ق ۔ ن ۔ ی۔ عربی زبان کے ۲۸ حروف تہجی میں سے یہ بائیس حروف تہجی ایسے ہیں جن میں امتیاز نقطوں ہی کے ہونے نہ ہونے یا اوپر نیچے ہونے یا کم وبیش ہونے کی وجہ سے ممکن ہے واضع حروف نے جس دن ان حرفوں کو وضع کیا تھا

اگر اسی دن، اسی وقت نقطے بھی ایجاد نہیں کیے تھے اور نقطوں ہی کے ذریعے ان میں امتیاز نہیں رکھا تھا تو اس نے یہ بائس ہمشکل حروف وضع ہی کیوں کیے تھے؟ کیا وہ مختلف نقوش ایجاد نہیں کرسکتا تھا؟ "با" کو دیکھئے کہ اس کو با، تا، ثا، نا اور یا صرف نقطوں ہی کے فرق سے پانچ طریقے سے پڑھ سکتے ہیں۔ "جا" کو جا، حا، خا، تین طریقے سے۔ باقی چودہ حروف کو دو دو طریقے سے۔ اگر نقطوں کا فرق واضع نے وضع کے وقت ہی نہیں رکھا تھا تو یقیناً وہ واضع ہی دیوانہ تھا۔ فقط واضع ہی نہیں بلکہ ساری قوم ہی دیوانی تھی کہ کبھی کسی نے زبان کی اس تحریری گمراہ کن خامی کی طرف توجہ نہ کی۔ اور اپنی رسم خط کی اس بدترین خرابی کو دور کرنے کی ضرورت کسی شخص نے کبھی محسوس نہ کی۔ خدا جانے شعرائے جاہلیت جو اپنے قصائد سو سو اور ڈیڑھ ڈیڑھ سو شعروں کے لکھ لکھ کر خانہ کعبہ میں لٹکا دیا کرتے تھے ان کے پڑھنے والے ان کو کس طرح پڑھتے تھے؟ امراء القیس کا شہرہ آفاق قصیدہ جو سبعہ معلقہ کا پہلا معلقہ ہے، اس کا یہ شعر

وقد لغتدی والطیرنی وکناتھا
بمنجرد قید الا وابدھیکل

میں صبح کرتا ہوں ایسی ساعت میں کہ پرندے اپنے گھونسلوں میں ہوتے ہیں۔ اپنے اونچے گھوڑے کے ساتھ جو وحشی جانوروں کو گھیر کر قید میں رکھ لیتا ہے۔

کیا کسی نے اس کو وقد اغتذی بھی پڑھا تھا؟ یعنی میں اس وقت غذا کرتا ہوں جب پرندے اپنے گھونسلوں میں ہوتے ہیں اپنے گھوڑے کے

ساتھ الخ۔ یعنی خود بھی اسی وقت کھاتا ہوں اور اپنے گھوڑے کو بھی اسی وقت کھلاتا ہوں۔

تسلت عمایات الرجال عن الصبا
ولیس فؤادی عن ہواک بمنسل

لوگوں کے شوق ومحبت کی گراہیاں سرد پڑ گئیں
اور میرا دل تیری محبت سے کنارہ کش ہونے والا نہیں

کیا اس کو کسی نے کبھی یوں بھی پڑھا تھا۔

یسلت غمایات الرجال عن الصبا
ولیس فوادی عن ہواک بمنسل

میں نے لوگوں کو ان کی بیخودیوں پر جو غایت شوق میں پیدا ہوئیں ملامت کی
حالانکہ خود میرا دل تیری محبت سے کنارہ کش ہونے والا نہیں

تجاوزت احراساً علی
ومشرا علی حراصاً لو یسرون مقتلی

میں اس کے نگہبانوں اور اس کے لوگوں سے کتراکر نکل گیا
ایسے نگہبان اور ایسے لوگ جو میری تاک میں لگے رہتے تھے کہ کسی طرح
چھپ کر مجھ کو قتل کرسکیں

کیا اس کو کسی نے یوں پڑھا تھا۔

تحاورت لحراساً علی و مشراً

میں نے اس کے نگہبانوں اور اس کے لوگوں سے (دوبدو) باتیں کیں (دلیری
کے ساتھ)

جب کہ اس مفہوم میں اصل شعر کے مفہوم سے زیادہ بہادری کا اظہار ہے باوجود اس کے کسی نے کبھی تجاوزت کو تحاورت نہیں پڑھا۔

غور فرمائیے کیا کبھی کسی نے اس قسم کی روایت کی ہے کہ معلقات سبعہ میں نقاط واعراب نہ ہونے کی وجہ سے کوئی کسی طرح پڑھتا تھا۔ کوئی کسی اور طرح؟ تمام عربی، لٹریچر چھان مارئے۔ کبھی کسی نے سبعہ معلقات یا دوسرے قدیم اشعار کے لئے اس قسم کی بات نہیں کی۔ پھر آخر کیا بات ہے کہ یہ باتیں صرف قرآن مجید ہی کے لئے کہی جاتی ہیں۔ کیا یہ سارے اختلافات قرآت قرآن ہی کے لئے تھے؟ معلقات شعرائے جاہلیت کو کبھی ان سے سابقہ نہیں پڑا۔ کیوں پڑتا؟ نہ اس وقت کوفہ تھا، نہ کوفے کے مفسدین ملاحدہ تھے۔ نہ کسی کو خواہ مخواہ ان میں اس طرح کے اختلافات پیدا کرنے کی اس وقت ضرورت تھی۔ قرآن مجید میں تو قصداً یہ اختلافات پیدا کئے گئے ہیں اور اسی غرض سے یہ مشہور کیا گیا ہے کہ عربی رسم الخط میں نقطے نہ تھے۔ سو برس کے بعد نقطے لگائے گئے اور اعراب بھی نہ تھے۔

خیر زمانہ جاہلیت کی باتیں جانے دیجئیے۔ جب وحی آنا شروع ہوئی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن مجید کی آیتیں اور سورتیں لکھوانا شروع کردیں تو آپ کو تو اس کا خیال ہوتا کہ بے نقطوں کی تحریر اتنے باہم متشابہ حروف والی رسم خط میں کس طرح صحیح طور سے پڑھی جائے گی؟ کاتبین وحی سے آپ فرماتے کہ نقطے دے کر لکھا کرو۔ کیونکہ واضع حروف نے ضرور حروف پر نقطے لگائے تھے اور اگر واضع حروف پاگل تھا اور عہد

جاہلیت کے سب لکھے پڑھے دیوانے تھے کہ ایسی گمراہ کن رسم خط کو گلے لگائے ہوئے تھے تو آپ خود نقطے لگانے کی ترکیب بتادیتے۔ فراست نبویہ عبدالملک وحجاج کی عقل سے تو یقیناً کہیں بڑھی ہوئی تھی اور اگر یہ کہا جائے کہ چونکہ آپ خود لکھے پڑھے نہ تھے اس لئے آپ کو اس کا احساس ہی نہ ہوا کہ حروف پر نقطے نہ ہونے سے کیا خرابی واقع ہوگی تو کم سے کم کاتبین وحی تو متعدد تھے۔ خلفائے راشدینؓ جیسے برگزیدہ اور دور اندیش لوگ وحی لکھتے تھے، وہ لوگ یا ان میں سے کوئی تو محسوس کرتا کہ جس رسم خط میں اس قدر تشابہ حروف ہیں ان کے پڑھنے میں آئندہ لوگوں کو کس قدر دشواری ہوگی؟ اگر ان لوگوں نے بھی محسوس نہیں کیا تھا تو اللہ تعالیٰ نے اس قرآن کو بلسان عربی مبین اتارا تھا۔ اور ابانتہ (مبین ہونا) دو ہی طرح کسی قول کی ممکن ہے۔ زبان سے[1] یا قلم سے ۔ مگر زبان سے ابانت پائیدار نہیں رہ سکتی۔ آواز ہوا میں غائب ہوجاتی ہے۔ کتاب ہی پائیدار ابانت کا ذریعہ ہے اور عربی رسم الخط کا حال اللہ تعالیٰ عالم الغیب والشہادۃ کو معلوم ہی تھا کہ اس میں اٹھائیس حروف ہیں جن میں بائیس حروف ایسے ہیں جنہیں ایک پاگل واضع حروف نے باہم متشابہ وضع کیا

---

(۱) مبین کا مفہوم اصل تو یہی ہے کہ آیات قرآنی کے الفاظ، اس کے جملے، اسکی عبارتیں اپنے مفہوم کو واضح طور سے ظاہر کرتی ہیں مگر وہ الفاظ وہ جملے اور وہ عبارتیں اس کے لئے مبین ہوتے ہیں جس کے پاس پہنچتی ہیں نہ کہ خود اپنے لئے۔ تو دوسروں تک دو ہی ذریعے سے پہنچ سکتے ہیں۔ زبان کے ذریعہ قولاً یا قلم کے ذریعے کتابتاً، قولاً ناپائیدار ذریعہ ہے اور کتابتاً پائیدار ذریعہ ہے۔ اسی لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نازل شدہ آیات وسورۃ کی صرف زبانی تعلیم نہیں فرماتے تھے بلکہ لکھوادیا کرتے تھے اور صحابہؓ اس کی نقلیں اپنے پاس بھی رکھ لیا کرتے تھے۔ آگے اس کی بحث کی گئی ہے۔ (تمنا)

ہے اور کوئی ایسی علامت نہیں رکھی ہے جس کے ذریعہ ایک دوسرے سے تمیز کیا جاسکے۔ ایسی گمراہ کن رسم خط میں جو عبارت لکھی جائے گی بذات خود وہ ہزار مبین ہو مگر پڑھنے والے کے لئے اس کی ہیئیت کی نوعیت اس ہرے بھرے انواع واقسام کے پھولوں اور پھلوں والے باغ کی طرح ہوگی جو کسی ایسے پردہ ظلمات میں واقع ہو جہاں کسی کو کچھ نظر نہیں آتا۔

اللہ تعالیٰ نے حضرت جبریل علیہ السلام کے ذریعہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مطلع کردیا ہوتا کہ تمہاری زبان کی رسم خط سخت گمراہ کن ہے۔ اس کے فلاں فلاں حروف پر اس طرح نقطے دلواکر متشابہ حروف میں باہم امتیاز پیدا کرنے کے لئے اپنے کاتبوں سے کہو۔ جس دشواری کو آغاز نزول قرآن کے بعد سے کم و بیش سو برس تک نہ عام صحابہ نے نہ کاتبین وحی نے نہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نہ حضرت جبریل علیہ السلام نے نہ خود اللہ تعالیٰ نے محسوس فرمایا۔ اس کو سو برس کے بعد محسوس کیا تو اس شخص نے جو صرف اموی ہونے کی وجہ سے باوجود خلیفہ اور امیرالمومنین ہونے کے بعض طبقوں میں بدنام ہے اور اس نے بھی یہ کام اس شخص سے لیا جس پر روایت پرست حلقوں میں آج تک سب وشتم کو کار ثواب سمجھا جاتا ہے بلکہ جس پر کتنے لوگوں نے کفر کا فتویٰ تک دے دیا تھا۔ یعنی حجاج بن یوسف الثقفی جس کے[1] متعلق ابن حجر تہذیب التہذیب جلد ۲ صفحہ ۲۱۱ میں لکھتے ہیں۔ قال زاذان کان مفلسا

---

[1] ترجمہ:-
حجاج کے متعلق زاذان نے کہا کہ دینی حیثیت سے یہ شخص مفلس تھا طاؤس نے کہا کہ جو اس کو مومن کہتا ہے مجھ کو اس پر تعجب ہوتا ہے اور ایک جماعت نے اس کو کافر قرار دیا تھا جن

من دینه و قال طاؤس عجبت لمن یسمیه مؤمنا و کفره جماعة منهم سعید بن جبیر و النخعی و مجاهد و عاصم بن ابی النجود و الشعبی و غیرهم ..... و قال القاسم بن مخیمرہ کان الحجاج ینقبض عری الاسلام عروة عروة) عبدالملک نے جو سو برس کے

میں سعید بن جبیر نخعی ، مجاہد ، عاصم بن ابی النجود اور شعبی وغیرہم تھے۔ قاسم بن مخیمرہ نے کہا کہ حجاج نے تو اسلام کی دھجیاں اڑا کر رکھ دی تھیں " حقیقت یہ ہے کہ کوفہ اور بصرہ حضرت فاروق اعظمؓ کے وقت ہی سے مفسدوں کا مرکز تھے۔ خصوصاً کوفہ - یہ موقعہ اس کی تفصیل کا نہیں ہے- بڑے ہٹ دھرم ، بڑے شورہ پشت لوگ یہاں تھے جو تابعین وتبع تابعین کا لبادہ اوڑھے رہتے تھے- تنگ آکر خلیفہ وقت نے وہاں کے مفسدین کی سرکوبی کے لئے حجاج کو بھیج دیا۔ حجاج نے وہاں ہر مقتبہ شخص کو سزائیں دینا شروع کیں کسی کو قتل کیا کسی کو کوڑے ۔ ۔ ۔ کسی کو قید کر دیا۔ اس لئے کوفی اور بصری دونوں ان سے خفا رہے - بصریوں نے اشعث کی سرکردگی میں اس پر خروج بھی کیا تھا مگر شکست کھائی- باغیوں میں قاریوں کی خاص جماعت تھی- سعید بن جبیر بھی انہی باغیوں میں تھے اگر چہ یہ کوفی تھے- اشعث کی شکست کے آثار دیکھ کر بھاگ نکلے اور مکہ معظمہ پہنچ گئے- وہاں چھپے رہے- کچھ مدت کے بعد وہاں کے والی خالد بن عبداللہ القسری نے ان کو پا لیا اور گرفتار کرکے حجاج کے پاس بھیج دیا- حجاج نے پوچھا تمہیں بغاوت پر کس چیز نے آمادہ کیا تھا- انہوں نے کہا کہ میں بیعت کرچکا تھا (یعنی اشعث کے ہاتھ پر) حجاج نے کہا کہ امیرالمومنین کی بیعت وفاداری کی زیادہ مستحق تھی یا باغیوں کی جمعیت ؟ اس کے بعد قتل کا حکم دیا- غرض کوفیوں ہی نے بصرے میں بغاوت کی سازش کی تھی اور بصرے والوں کو خروج پر آمادہ کیا تھا اس لئے سعید بن جبیر جو بنی اسد کے غلام آزاد کردہ تھے اور متعدد کوفی بصریوں کے ساتھ اس بغاوت میں شریک ہوئے- کوفے میں بنی اسد کا ایک محلہ تھا جس میں ننانوے فی صد شیعہ تھے اور زاذان ابو عبداللہ کندیوں کے آزاد کردہ غلام تھے اور کوفی تھے- طاؤس بحیر بن ریسان کے غلام تھے جو ہمدانیوں کی غلامی میں آکے آزاد ہوئے- آزادی سے قبل کوفے میں تھے- آزاد ہوکر بصرہ چلے آئے تھے ابراہیم نخعی بھی کوفی ہی تھے- مجاہد بن جبیر سائب بن ابی السائب کے غلام آزاد کردہ تھے مکہ معظمہ میں عطر فروشی کرتے تھے- اور کوفیوں کے مستقل ایجنٹ تھے- ان کے یاران طریقت نوے فیصد کوفی ہی تھے- ان کا ذکر قاریوں کے سلسلہ میں آئے گا- عاصم بن ابی النجود کوفی تھے اور قاریوں کے استاد اختلاف قرآت کے بڑے بڑے کارخانے کھول رکھے تھے- عامر بن شراحیل الکوفی ان کا لقب شعبی مشہور ہے- کوفہ کے بڑے مشہور محدث تھے- حضرت علی رضی اللہ عنہ کی طرف فرائض کے بہت

بعد قرآنی رسم خط کی اصلاح کا کام سپرد بھی کیا تو ایک کافر کو ۔ اسلام کی اتنی بڑی خدمت اس کے ہاتھ سے انجام پائی جس نے بقول قاسم بن مخیمرہ اسلام کی دھجیاں اڑا کر رکھ دی تھیں

رہ گئے سب یونہیں شیوخ حرم
کام کا ایک رند ہی نکلا

ایک تعجب خیز تاریخی حقیقت مودودی صاحب نے دو تاریخی حقیقتیں " بیان فرمائی ہیں ایک کا تعلق اعراب یعنی زبر، زیر، پیش کی ایجاد سے ہے اور دوسری " حقیقت " کا تعلق نقطوں کے " پہلے پہل " اختراع سے ۔ مودودی صاحب کے بیان کے مطابق پہلے زیاد کو اعراب کی ضرورت محسوس ہوئی تھی ۴۵ ھ سے ۵۳ ھ تک کے درمیان اس آٹھ سال کے اندر زیاد نے ابوالاسود دولی سے قرآن مجید کے حروف پر اعراب لگوائے۔ مگر اس وقت بھی نہ زیاد کو نقطوں کے لگانے کی ضرورت محسوس ہوئی نہ ابوالاسود کو ۔ حالانکہ ہر موٹی سے موٹی عقل والا بھی اس کو سمجھ سکتا ہے کہ ایسی متشابہ حروف والی رسم الخط کے لئے اعراب سے زیادہ نقطے ضروری ہیں ۔ آپ اردو ہی رسم الخط کو دیکھئے ۔ بغیر زیر، زبر،

سے مسائل بنا بنا کر منسوب کرکے روایت کیا کرتے تھے۔ حالانکہ ان سے کچھ سنا بھی نہ تھا ۔ بہت سے صحابہؓ سے روایت کرتے تھے مگر ان میں سے کتنے ایسے تھے جن سے کبھی کچھ نہیں سنا تھا لیکن محدثین کے نقطہ نظر سے بہت بڑے عالم اور اپنے وقت کے عبداللہ بن عباس تھے ۔ بہرحال رحمہ اللہ تعالیٰ ۔ لیکن یہ معلوم ہوگیا کہ حجاج پر کفر کا فتویٰ دینے والے سب کے سب کوفی تھے یا کوفیوں سے تعلقات رکھنے والے اور ان میں بہت بڑی اکثریت غلاموں کی تھی اس وقت حجاج کی صفائی میرا مقصود نہیں ہے ، صرف صورتحال میں نے پیش کردی ہے۔ تاکہ اہل انصاف کو غور کرنے کا موقع ملے ۔ (تمنا)

پیش کے ہر شخص لکھتا اور پڑھتا ہے۔ کوئی بھی کسی قسم کی دشواری محسوس نہیں کرتا۔ لیکن فقط ایک صفحہ بغیر نقطوں کے لکھ دیا جائے تو پڑھنے والے کو ضرور دشواری محسوس ہوگی اور ہوسکتا ہے کہ مودودی صاحب ہی کی عبارت سے نقطے حذف کرکے لکھئے تو ان کی " تاریخی حقیقتوں " کو کوئی ، " نارنجی حقیقتیں " پڑھ دے اور " مشرکین " کو " مسٹر کین " سمجھ لے، اور " بعض " کو " بغض " اور " بیٹھے " کو " پیٹھے " بتادے تو کیا یہ ناممکن ہے؟

اس لئے مجھ کو یقین ہے کہ ان " تاریخی حقیقتوں " پر تاریخ روایت کا رنگ چڑھانے والے بھی کچھ اسی قسم کا دماغ رکھنے والے تھے جیسا دماغ عربی حروف تہجی وضع کرنے والے کا تھا جس نے اٹھائیس حروف تو وضع کئے مگر ان میں سے بائیس حرف کو اس طرح وضع کیا کہ ان میں سے ایک کو دوسرے کے مشابہ ہی نہیں بلکہ بالکل عین رکھا۔ پتا نہیں ملا کہ " ح " لکھنے کے بعد وہ اس کو کیا کہتا ہوگا؟ جیم یا حے یا خے؟ غرض واضع حروف نے متشابہ حروف میں جس طرح مابہ الامتیاز کوئی علامت ہر حرف کے ساتھ رکھنے کی کوئی ضرورت محسوس نہیں کی اور نہ عہد جاہلیت نہ عہد اسلام کے کسی شخص نے ۶۵ھ سے پہلے اس کو محسوس کیا۔ اسی طرح زیاد اور ابوالاسود دوئلی بھی بازار سے آٹا دال تو لائے نہیں کھانا پکانے کے لئے پہلے ہی لگے چولہا پھونکنے۔ نقطوں کے بغیر تو حروف کی شناخت ہی ممکن نہیں۔

<u>عذر گناہ</u> درحقیقت حروف کی تخلیق تو نقطے لگانے کے بعد ہی مکمل ہوتی ہے۔ اعراب تو عارضی چیز ہے۔ ان روایتوں کے بنانے والے اگر کچھ بھی

عقل سے کام لیتے تو نقطوں کے وضع کرنے کا سہرا زیاد اور ابوالاسود کے سر باندھتے اور اعراب کی پگڑی عبدالملک اور حجاج کے سر پر رکھتے۔ مگر میں نے اپنے متعدد مضامین میں یہ لکھا ہے کہ اللہ تعالیٰ وضاعین وکذابین کی عقلوں پر وضع روایات کے وقت کچھ ایسا پردہ سفاہت ڈال دیتا ہے کہ کچھ نہ کچھ بات ان کی مرویات یا اسناد روایت میں ایسی رہ جاتی ہے جس کی گرفت ایک نقاد بادنیٰ تامل کرلیتا ہے۔ بشرطیکہ روایت پرستی اس پر مسلط نہ ہو۔ ورنہ بڑے بڑے ائمہ فن رجال اور اساتذہ تنقید روایات جن کی تصنیفوں سے آج ہم فائدہ اٹھا رہے ہیں ایسی ایسی خلاف عقل ومخالف قرآن مرویات پر ایمان رکھتے ہیں کہ تعجب ہوتا ہے ۔ مخالفت روایت ومعاندت آیت ان کو معلوم بھی ہوتی ہے تو بعید از قیاس اس کی تاویل کرکے اپنے دل کو وہ زبردستی مطمئن کرلیتے ہیں اور دوسروں پر بھی زور دیتے ہیں کہ بس اس تاویل کو مان لو اور روایت کو صحیح تسلیم کرلو۔ چاہے تمہارا دل مطمئن ہو یا نہ ہو۔ اور "عذر گناہ بدتر از گناہ" کی مثل کو بالکل بھول جاتے ہیں۔ گناہ تو وضاعین وکذابین کرگئے۔ عذر گناہ یہ روایت پرست کرتے رہتے ہیں۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ عربی رسم الخط کے واضع نے جب اٹھائیس حرفوں میں سے بائیس حروف اس قدر باہم متشابہ رکھے تھے کہ بغیر نقطہ لگائے لکھنے والا نہ یہ دعویٰ کرسکتا تھا کہ میں نے فلاں حرف لکھا اور نہ پڑھنے والا یہ یقین کرسکتا تھا کہ یہ فلاں حرف لکھا گیا ہے مثلاً ب، ح، د، ر، س، ص، ا، ع۔ یہ آٹھ شکلیں مفرد ہوں یا مرکب کسی حالت میں بھی متعین نہیں ہوسکتی تھیں کہ یہ کون کون سے حرف ہیں۔ صرف اس لئے

کہ ہر شکل ایک سے زیادہ حرفوں کے نام سے موسوم ہے۔ نقطوں سے قطع نظر کرنے کے بعد کوئی بتائے۔کم ازکم (ب) ہی کو بتادے کہ یہ کون سا حرف ہے اور بحالت ترکیب "با" کی شکل کو بتائے اور ماکو بھی ۔ آخر پڑھنے والا کیا پڑھے گا۔ اور لکھنے والا بھی ضرور سمجھ سکتا ہے کہ پڑھنے والا حرف کا نام متعین نہیں کرسکے گا پھر عربی رسم الخط کا واضع کس طرح ان متشابہ حرفوں کو بغیر نقطوں کے وضع کرسکتا تھا؟

یہ عقلی دلیل تو اتنی قوی ہے کہ واضع نے عربی حروف تہجی پر ضرور نقطے لگائے ہوں گے اور جو صورتیں نقطوں کی اس وقت ان حروف پر ہیں یہ واضع حروف کی وضع کردہ ہیں۔ ہرگز کسی نے بعد کو وضع نہیں کیا۔ جو یہ مانتا ہے کہ کئی سو برس کے بعد نقطے لگائے گئے وہ ضرور عقل سے معذور ہے اور ان روایتوں پر ایمان رکھنے والے اس شخص کی طرح ہیں جس کے پاس مخبر نے آکر خبر دی تھی کہ تمہاری بی بی بیوہ ہوگئی ہیں اور وہ یہ سن کر زار وقطار رونے لگا۔ بعد کو لوگوں نے سمجھایا کہ تم تو زندہ ہو تو تمہاری بیوی بیوہ کس طرح ہوجائے گی۔ یہ خبر غلط ہے تو اس نے کہا کہ بات تو ٹھیک ہے مگر جس نے خبر دی تھی وہ نہایت معتبر اور سچا آدمی ہے ۔ اس کو ہم جھوٹا نہیں سمجھ سکتے۔ اس لئے ضرور بیوہ ہوگئی ۔ یہ کہہ کر پھر منہ پیٹنے لگا۔

اس کے بعد کسی دلیل نقلی کی ضرورت نہیں رہتی ۔ مگر ما لایدرک کله لایترک کله لیجئے کچھ نقلی دلیلیں بھی حاضر ہیں۔ ابن[1] جنی نے بھی

---

[1] ابوالفتح عثمان بن جنی النحوی الموصلی المتوفی ۳۹۲ھ (مراۃ الجنان) تمنا۔

اپنے امالی (ص ۲۲) میں اس کا دعویٰ کیا ہے کہ عربی حروف پر نقطے ابتدائے روز وضع سے چلے آرہے ہیں اور یہ روایت کہ زمانہ اسلام میں نقطے لگائے گئے جھوٹی روایت ہے۔ انہوں نے جاہلیت کے دو شعر بھی ثبوت میں دیئے ہیں۔

رمتنی بسهم نقّطت منه جفنتی
و اذنقطت عينٌ تذرفُ كالغين

محبوبہ نے مجھ کو ایک تیر مارا جس سے میرے پپوٹے پر نقطے جیسا زخم پہنچ گیا
اور جب کسی آنکھ پر نقط جیسا زخم لگا تو وہ ضرور ابر کی طرح آنسو بہا۔ لگے

نقطہ ، عین، غین کے الفاظ سے جو استعارہ اس شعر میں ہے اس کو ملاحظہ فرمایئے۔ یہ اس زمانے کا شعر ہے جس زمانے میں بقول راویان " حقائق تاریخی " حروف تہجی پر نقطے کا وجود ہی نہ تھا نہ کوئی حرفوں کے لئے نقطوں کو جانتا تھا۔

دوسرا شعر بھی ہے۔

اهی النجوم تعرضت فی سقفها
ام اعجمو الوحاً بغير حروف

کیا یہ آسمان کی چھت پر ستارے چھٹکے ہوئے ہیں
یا حروف کے بغیر کسی نے صفحہ ورق پر خالی بہت سے نقطے لگا دیئے ہیں

اعجام حروف پر نقطے لگانے کو بھی کہتے ہیں اور اعراب لگانے کو بھی۔ اسی لئے نقطہ دار حروف کو معجمہ کہتے ہیں۔

ابن ندیم[۱] اپنی شہرہ آفاق کتاب الفہرست کے صفحہ ۶، ۷ میں لکھتے ہیں قال ابن

---

[۱] ابوالفرج محمد بن اسحاق الندیم مصنف کتاب " الفہرست " المتوفی ۳۸۵ھ مگر یہ غالی شیعہ تھے۔ تمنا

عباس اول من كتب العربية ثلاثة رجال من بولان وهی قبیلة سکنو الانبار وانهم اجتمعوا ووضعوا حرونا مقطعة وموصولة وهم مرامرين مرة واسلم بن سدرة و عامر بن جدرة و یقال مروة و جدلة- فامامرامر نوضع الصبور و اما اسلم نفصل ووصل و اما عامر نوضع الاعجام - یعنی حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ سب سے پہلے جس نے عربی رسم خط میں لکھا وہ تین مرد تھے قبیلہ بولان کے جو انبار کے رہنے والے تھے۔ وہ سب یکجا ہوئے اور الگ الگ اور جڑے ہوئے حروف وضع کرنے لگے اور وہ تینوں مرامر مرہ کے بیٹے، اسلم سدرہ کے بیٹے. اور عامر جدرہ کے بیٹے تھے، اور بعضوں نے مرہ کے عوض مروہ اور جدرہ کی جگہ جدلہ بھی کہا ہے۔ تو مرامر نے حروف کی صورتیں مقرر کیں، اور اسلم نے اس کی جوڑ پیوند اور الگ رہنے کی ہیئات قائم کیں اور عامر نے ان پر نقطے لگائے۔

صفحہ ۹ پر حمیری حروف تہجی کی تصویر بھی دی ہے اس میں بھی نقطے موجود ہیں۔ جہاں نقطے نہیں ہیں کوئی دوسری علامت ایسی موجود ہے جو ایک دوسرے ہمشکل حرف سے ممتاز کردے۔ اس مختصر سے مضمون میں اس سے زیادہ گنجائش نہیں جس قدر لکھ گیا ہوں ایک دیانتدار عاقل کے لئے اسی قدر بہت کافی ہے۔ ع

"درخانہ اگر کس است حرفے بس است۔"

ورنہ روایت پرستی کی ہٹ دھرمی جن کا شیوہ ہے ان کے سامنے تو جتنی بھی دلیلیں پیش کیجئے وہ کبھی ماننے کے نہیں۔

اب مودودی صاحب کروٹ بدلتے ہیں مگر آہستہ آہستہ، سنئے ارشاد

فرماتے ہیں۔

" اگر قرآن کی اشاعت کا دارومدار صرف تحریر پر ہوتا تو جس رسم الخط میں امت کو یہ کتاب ملی تھی اس کو پڑھنے میں تلفظ اور اعراب ہی کے نہیں، متشابہ حروف کے بھی کتنے بے شمار اختلافات ہوگئے ہوتے۔ محض زبان اور قواعد کی بناء پر خود اہل زبان بھی اگر نقطے اور اعراب لگانے بیٹھتے تو قرآن کی ایک ایک سطر میں بیسیوں اختلافات کی گنجائش نکل سکتی تھی اور کسی ذریعے سے یہ فیصلہ نہ کیا جاسکتا تھا کہ اصل عبارت جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوئی تھی وہ کیا تھی؟ اس کا اندازہ آپ خود اس طرح کرسکتے ہیں کہ اردو زبان کی کوئی عبارت بے نقط لکھ کر دس جیں زبان داں اصحاب کے سامنے رکھ دیں۔ آپ دیکھیں گے کہ ان میں سے کسی کی قرآت بھی کسی

---

(۱) ہوگئے ہوتے کی ایک ہی کہی۔ کیا اس وقت اختلافات قرآت کا شمار کسی نے لیا ہے اتحاف فضلاء البشر فی القرآت اربعة عشر اور النشر فی الاقرآت العشر کو پڑھ جائیے اور اختلاف قرآت کو اگر گن سکتے ہوں تو گن کر دکھایئے۔ اور یہ تو وہ اختلافات ہیں جن کو قاریوں نے اصح یا صحیح قرار دے کر قبول کیا ہے ان سے دس گنا اختلافات تو رد کردیئے گئے۔ وہ بھی تو آخر روایات ہی کے ذریعہ پیش کئے گئے تھے مگر رد کرنا بھی ضروری تھا سب کو قبول کرلیتے تو ہر شخص کو ضرور شبہ ہوتا۔ اس لئے دس لاکھ اختلافات بنائے گئے اور ایک لاکھ رکھ کر نو لاکھ رد کردیئے تو اس سے ہر خاص وعام میں ایک اعتماد پیدا ہوگیا۔ ورنہ قابل رد تو دراصل سب تھے۔

(۲) اس کا علاج تو آسان تھا جس طرح انزل القرآن علی سبعة احرف کی حدیث بنائی گئی اسی طرح انزل القرآن علی احرف کثیرة لا تحصیٰ کی بھی ایک حدیث گھڑی جاتی بلکہ اس کی جگہ یہی حدیث رہتی۔ پھر جس کا جس طرح جی چاہتا اور جو مطلب چاہتا نکالتا۔

دوسرے کے مطابق نہ ہوگی۔ اس سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ قرآن میں نقطے اور اعراب لگانے کا کام محض لغت اور قواعد زبان کی مہارت کے بل بوتے پر نہیں کیا جاسکتا تھا کیونکہ اس طرح ایک مصحف نہیں بے شمار مصحف[1] تیار ہوجاتے جن میں الفاظ اور اعرابوں کے ان گنت اختلافات ہوتے اور کسی نسخے کے متعلق بھی یہ دعویٰ نہ کیا جاسکتا کہ ٹھیک اسی تنزیل کے مطابق ہے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوئی تھی۔"

اب مودودی صاحب گریز کرکے راہ پر آتے ہیں دیکھئے فرماتے ہیں۔

"اب وہ کیا چیز ہے جس کی بدولت آج دنیا بھر میں ہم قرآن کا ایک ہی متفق علیہ متن پارہے ہیں اور جس کی بدولت قرآتوں کے اختلافات امکانی وسعتوں تک پھیلنے کی بجائے صرف چند[2]

---

(۱) اس کی کوشش تو بہت کی گئی سات قاریوں کے سات اسکول قائم کئے گئے ۔ مصحف ابی بن کعبؓ اور مصحف عبداللہ بن مسعودؓ اور مصحف علی بن ابی طالبؓ کے نام سے مصاحف مشہور کرکے ترتیب سور میں الٹ پلٹ تو کی ہی گئی۔ آیات کے الفاظ میں کمی و بیشی اور الفاظ کے نقاط واعراب میں بھی فرق قائم کیا گیا۔ مگر ان کے پاس نحن نزلنا الذکر وانا له لحافظون - کا کوئی علاج نہ تھا۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے خود ساختہ سارے اختلافات کو ان کی تصنیف کردہ کتابوں اور روایات کے دفاتر تک ہی رہنے دیا۔ کسی ایک اختلاف کو بھی قرآن مجید میں داخل نہ ہونے دیا۔ اس نے خود فرمایا ہے ان الذین یلحدون فی ایاتنا لا یخفون علینا - جو لوگ ہماری آیتوں میں ٹیڑھ کی لیں گے وہ ہم سے کچھ چھپے نہیں رہیں گے ۔ (حم سجدہ آیت ۴)

(۲) "چند" آپ کہہ رہے ہیں ؟ کم سے کم دس ہزار اختلافات آج قرآت کی بڑی بڑی کتابوں

متواتر یا مشہور اختلافات تک محدود رہ گئے۔ یہ اسی نعمت کا صدقہ ہے جس کی قدر گھٹانے اور جس پر سے اعتماد اٹھانے کے لئے منکرین حدیث ایڑی چوٹی کا زور لگا رہے ہیں ۔ یعنی روایت ۔"

مودودی صاحب راہ پر آتے آتے پھر بھٹک گئے اور اپنی اسی روایت پرستی والی دلدل میں پھنس گئے۔ کوئی بتائے کہ روایت والی نعمت جو ان روایت پرستوں کو ملی ہے ۔ اس کے صدقے میں ان کو اس موقع پر کیا ملا؟ اس کا ذکر چھیڑ دیا۔ انہی روایتوں کی بناء پر تو اختلافات قرآت کا ایک دریائے ناپیدا کنار موجیں مار رہا ہے۔ اگر یہ سبعۃ احرف والی حدیث موضوع نہ ہوتی اور اس کی بنیاد پر اختلاف قرآت کی روایتوں کی اینٹیں نہ چنی جاتیں تو یہ اختلاف فی القرآن کی سر بفلک عمارتیں (النشر فی القراء ات العشر اور اتحاف فضلاء البشر فی القرآت اربعۃ عشر) جیسی ضخیم ضخیم کتابوں کے ذریعہ کہاں سے کھڑی ہوتیں اور آج ایک سائل متحیر کو مودودی صاحب سے اختلاف قرآت کے متعلق اپنی تشفی چاہنے کی کیا ضرورت پڑتی؟ یہ واقعہ ہے کہ اگر روایتیں نہ ہوتیں تو مودودی صاحب اور ہمارے علمائے کرام کو اختلافات کثیرہ فی القرآن کی نعمت عظمیٰ کہاں سے ملتی؟ یہ نعمت عظمیٰ تو انہی روایتوں کے صدقے میں

میں موجود ہیں جن کو قاریوں نے قبول کر لیا ہے ۔ قرآت مردودہ سے قطع نظر کرکے اور متواتر تو قرآن مجید سے باہر ایک قرآت بھی نہیں ۔ متواتر تو یہی ہے جس کو ساری دنیا پڑھ رہی ہے اس کے علاوہ ایک لفظ کے متعلق کوئی دوسری قرآت متواتر نہیں دکھائی جا سکتی۔ ھاتوا برھانکم ان کنتم صادقین ۔ اگر تم لوگ سچے ہو تو اپنی دلیلیں پیش کرو۔

ملی ہے۔

قراء سبعہ کا تھوڑا سا حال اس مضمون میں انشاء اللہ بیان کروں گا تاکہ "قیاس کن زگلستان من بہار مرا" کے مطابق قرآتوں کے جو سات اسکول مشہور ہیں اور جن کی قرآتوں کو محض جھوٹ متواتر مشہور کر رکھا گیا ہے عام مسلمانوں کو ان کا حال معلوم ہوجائے اور اس کا پتہ بھی مل جائے کہ ان کی روایات اختلافات قرآت واقعی مسلمانوں کے لئے نعمت ہیں۔ یا نقمت، اور یہ حقیقت بھی واضح ہوجائے کہ خود ائمہ رجال کے نزدیک ان کا کیا درجہ ہے۔ اسی نعمت عظمیٰ کا ذکر کرکے مودودی صاحب مزید ارشاد فرماتے ہیں۔

"اوپر جن دو تاریخی حقیقتوں کا ذکر کیا گیا ہے (جن کی حقیقت ناظرین کو معلوم ہوچکی ہے۔ تمنا) ان کے علاوہ ایک تیسری اہم ترین تاریخی حقیقت بھی ہے اور وہ یہ کہ قرآن کی اشاعت ابتداً تحریر کی صورت میں نہیں بلکہ زبانی تلقین کی صورت میں ہوئی تھی۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن کی عبارت کو کاتبان وحی سے لکھوا کر محفوظ تو ضرور کرادیا تھا لیکن عوام میں اس کے پھیلنے کا اصل ذریعہ یہ تھا کہ لوگ براہ راست حضور کی زبان سے سن کر قرآن یاد کرتے تھے۔ اور پھر حضور سے سیکھنے والے آگے دوسروں کو سکھاتے اور حفظ کراتے تھے۔ اس طرح قرآن کا صحیح تلفظ اور صحیح اعراب جو تنزیل کے مطابق تھا ہزارہا آدمیوں کو حضور سے معلوم ہوا اور پھر لاکھوں آدمیوں کو حضور

صلی اللہ علیہ وسلم کے شاگردوں کی زبانی تعلیم سے حاصل ہوا۔ صحابہ کرامؓ میں ایک معتد بہ گروہ ایسے اصحاب کا تھا جنہوں نے پورا قرآن لفظ بلفظ حضور سے سنا تھا اور یاد کیا تھا ہزارہا اصحاب ایسے تھے جو قرآن کے مختلف اجزاء حضور سے سن کر یاد کر چکے تھے۔ اور ایک بہت بڑی تعداد ان صحابیوں کی تھی جنہوں نے حضور کی حیات طیبہ میں تو آپ سے صرف بعض اجزائے قرآن کی تعلیم حاصل کی تھی۔ مگر آپ کے بعد پورے قرآن کی قرآت لفظ بلفظ ان اصحاب سے سیکھی جو حضور سے اس کو سیکھ چکے تھے۔ یہی اصحاب وہ اصل ذریعہ تھے جن کی طرف بعد کی نسل نے قرآن کی صحیح قرآت (READINGS) معلوم کرنے کے لئے رجوع کی۔ اس قرآت کا حصول محض لکھے مصحف سے ممکن نہ تھا۔ یہ چیز صرف اسی طرح حاصل ہو سکتی تھی کہ مصحف مکتوب کو ان جیتے جاگتے مصاحف سے پڑھ کر اس کی اصل عبارت تک رسائی حاصل کی جائے۔

مودودی صاحب اس نعمت عظمیٰ کا ذکر فرماکر جو راویان روایات اختلافات قرآت سے انہیں ملی ہے جب فریضہ تحدیث نعمت سے سبکدوش ہو چکے تو پھر ان دو تاریخی حقیقتوں کو انہوں نے یاد دلایا ہے جن کو نگاہ میں رکھ کر دیکھنے کا وہ پہلے حکم دے چکے ہیں اور جن پر ہم تبصرہ کر چکے ہیں یعنی:

(۱) ۶۵ھ تک قرآن کے حروف بلکہ پورے اہل عرب ہی عام حروف عربی کے لئے اعراب کے نام سے آشنا نہ تھے۔ ابوالاسود دولی نے زیاد کے حکم

سے پہلے نقطوں کی شکل میں حروف کے اوپر نیچے اور بیچ میں ایک ایک نقطہ رکھ کر زیر زبر اور پیش سے مسلم اہل عرب کو ۵۳ھ سے ۳۵ھ کے اندر کسی دن آشنا کیا۔

(۲) اہل عرب حروف کے لئے نقطے بھی ہونے چاہئیں اس کو کبھی محسوس نہ کرسکے تھے بلکہ (ابتدائی) اسلامی عہد میں بھی صحابہ، رسول، جبریل یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے بھی نقطوں کی ضرورت عربی حروف تہجی کیلئے محسوس نہیں کی تھی۔ پہلی مرتبہ عبدالملک کے حکم سے حجاج نے دو گمنام عالموں کے ذریعہ یہ بے ضرورت ایجاد کرکے دنیائے عرب کو اس کی ضرورت سے آشنا کردیا۔ بس اسی وقت سے عربی حروف کے لئے نقطوں کی ضرورت دنیا کو محسوس ہونے لگی۔ لیکن اس سے پہلے یہ بالکل بے ضرورت ہی تھے۔ ورنہ اگلوں میں سے کسی کو تو اس کی فکر ہوتی۔ مگر ان دونوں حقیقتوں کی حقیقت آپ پر پوری طرح روشن ہو چکی ہے۔

اس کے بعد تیسری حقیقت کی طرف مودودی صاحب نے سائل اور ناظرین ترجمان القرآن کو متوجہ فرمایا ہے کہ ابتداً صرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہر وحی منزل کو لکھوا لیا کرتے تھے اور کوئی بھی قرآن کی کوئی سورت یا کوئی آیت لکھ کر اپنے پاس نہیں رکھتا تھا۔ صرف زبانی تعلیم کا رواج تھا۔ صحابہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے زبانی قرآن سن سن کر سیکھ سیکھ کر یاد کرلیا کرتے تھے۔ اس لئے ہر صحابی کو قرآن کی تعلیم زبانی ہی خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سیکھے ہوئے کسی صحابیؓ سے ہوا کرتی تھی۔ اس لئے ہر صحابیؓ کو اسی طرح قرآن یاد ہوا جس طرح قرآن اترا تھا۔

غرض مودودی صاحب نے سائل کے سوال کے دونوں ٹکڑوں کا تشفی بخش جواب دے دیا۔ کہ اختلاف قرآت کی وجہ تو یہ ہے کہ پہلے نہ حرفوں پر نقطے تھے نہ اعراب لگانے کا دستور تھا۔ اس لئے بے نقطہ واعراب عبارت کو کسی نے کسی طرح پڑھا۔ کسی نے کسی طرح پڑھا۔ اختلافات ہونے کی وجہ نقطوں اور اعراب کا نہ ہونا تھا یہ تو ماحصل تھا پہلی دونوں تاریخی حقیقتوں کا جس سے اختلافات قرآت کے پیدا ہونے کے اسباب پر روشنی ڈالی گئی اور کافی روشنی پڑ گئی۔

تیسری حقیقت کا بیان فرماکر آپ نے اس کا باعث بتادیا کہ ساری دنیا میں جو ایک ہی قرآن پونے چودہ سو برس سے علی سبیل التواتر ہر زمانے میں ہر شہر میں بلکہ ہر مسلم گھر میں چلا آرہا ہے جس میں ایک شوشے، ایک نقطے میں بھی اختلاف نہیں ۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ عہد نبوی میں بلکہ جمع صدیقیؓ کے قبل تک خلافت صدیقیؓ میں بھی قرآن مجید کی کتابت کوئی نہیں کرتا تھا۔ سب دوسرے سے زبانی سیکھتے اور یاد کرتے تھے بلکہ صدیق اکبرؓ نے بھی جو ایک نسخہ مصحف زید بن ثابت سے لکھوایا، اس کو بھی انہوں نے اپنے پاس مقفل ہی رکھا۔ کبھی کسی کو دکھایا تک نہیں کوئی اس میں پڑھتا کیا۔ حضرت صدیق اکبرؓ کے بعد بھی حضرت فاروق اعظمؓ کے پاس جو وہ مصحف صدیقیؓ پہنچا تو وہ اس کو اسی طرح کتاب مکنون سمجھ کر چھپائے رکھے رہے۔ ان کے بعد اسی طرح وہ مصحف حضرت عثمانؓ کو ملنا چاہیئے تھا۔ مگر ان کو نہ ملا۔ برخلاف قیاس اللہ جانے کیوں حضرت حفصہؓ کے پاس پہنچ گیا۔ اور وہاں بھی اسی طرح

مقفل ہی رہا۔ جب حضرت عثمانؓ نے ۳۰ھ[1] میں حضرت حفصہؓ کے یہاں سے وہ مصحف یا صحف صدیقیؓ بقول ابن شہاب زہری منگوا کر اس کی نقلیں کرائیں جب کہیں قرآن کی کتابی صورت لوگوں کی نظروں کے سامنے آئی۔ غرض مودودی صاحب کے فحوائے کلام سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ۳۰ھ تک قرآن کتابی صورت میں نہیں آیا تھا بجز مصحف صدیقیؓ کے جو برابر کتاب مکنون ہی رہا۔ کسی نے کبھی اس کی زیارت کی خواہش ظاہر کرنے کی بھی ضرورت نہیں سمجھی یا ہمت نہیں پڑی۔

سوال تو جب عہد عثمانیؓ نہیں، عہد فاروقیؓ تک یا عہد صدیقیؓ تک یا عہد نبوی ہی تک سہی صرف زبانی ہی تعلیم قرآن کا دستور تھا۔ کوئی شخص لکھتا ہی نہ تھا کہ لکھی کتاب میں نقطے اور اعراب نہ ہونے کی وجہ سے پڑھنے والا گھبراتا کہ کیا پڑھیں؟ اور ایک سے زیادہ پڑھنے والے اختلاف کرتے تو پھر یہ اختلاف قرآت کہاں سے آگیا؟

مودودی صاحب کی ایک تیسری حقیقت نے تو ان کی بیان کردہ پہلی دونوں تاریخی حقیقتوں کی دھجیاں اڑا کر رکھ دیں۔

یقیناً آپ کہیں گے کہ حضرت عثمانؓ کے وقت میں مسلمانوں کے پاس مصاحف تھے جبھی تو حضرت عثمانؓ نے جہاں جہاں مصحف بھیجا وہاں وہاں یہ بھی کہلا بھیجا کہ ہر شخص اپنے مصحف کو اسی کے مطابق کرلے اور جس نسخے میں زیادہ اختلاف ہو اس کو جلا دے۔ اس لئے اس تاریخی حقیقت سے کس طرح انکار کیا جائے گا پھر بخاری کی روایت ہے کہ

---

(۱) حسب حساب صحیح اور بقول ابن حجر ۲۵ھ میں۔ (تمنا)

چارانصاری صحابیوں نے عہد نبوی ہی میں مکمل قرآن کتابی صورت میں لکھ لیا تھا بلکہ آغاز نبوت ہی میں صحابہؓ اپنے پاس نازل شدہ آیات و سور لکھ لکھ کر رکھتے تھے۔ حضرت عمرؓ اپنی بہن کے یہاں مصحف دیکھ کر متعدد سورتوں کی مختلف آیتوں سے متاثر ہوئے تھے اور ایمان لائے تھے وہ مصحف حضرت خبیبؓ کا تھا جو وہاں لے کر وہ گئے تھے۔ اس لئے عہد نبوی میں قرآن کے لکھنے کا اور لکھ کر اپنے پاس رکھنے کا اور اس میں تلاوت کرنے کا بہت کافی دستور تھا۔ ہر لکھا پڑھا صحابیؓ اپنے پاس مصحف رکھتا تھا۔ امہات المومنینؓ میں سے ہر ایک کے پاس مصحف تھا۔ کتاب دیکھ کر پڑھنے کی ترغیب کیوں دی جاتی؟ اور آپ صحابہؓ کو قرآن ساتھ لے کر سفر کرنے سے کیوں منع فرماتے تھے؟ ان تمام باتوں سے تو صاف ثابت ہورہا ہے کہ عہد نبوی میں قرآن کی کتابت کا عام دستور تھا۔ اور ہر لکھا پڑھا صحابیؓ قرآن لکھ کر اپنے پاس رکھتا تھا۔ اور ترغیب نبوی کے مطابق کتاب دیکھ دیکھ کر پڑھتا تھا۔ تو وہ مودودی صاحب کی یہ تیسری حقیقت بھی تو ان دونوں پہلی تاریخی حقیقتوں کی طرح بالکل سراب ہی نکلی۔ تو پھر اصل حقیقت کیا ہے؟

میں اس کا جواب آپ کو آخر میں دوں گا۔ ابھی مودودی صاحب کی گہرافشانیوں کی سیر تو ختم کرلیجئے۔ مگر اپنے اس سوال کو اور میرے وعدے کو یاد رکھئیے۔ میں "اصل حقیقت" ہی کی سرخی کے ماتحت انشاء اللہ آپ کو تشفی بخش جواب دوں گا۔

مودودی صاحب اس کے بعد چوتھی تاریخی حقیقت بیان فرماتے ہیں کہ یہ بات تاریخ سے ثابت ہے کہ حضرت عثمانؓ نے قرآن کے جو مستند

نسخے لکھواکر مملکت کے مختلف مراکز میں رکھوائے تھے ان کے ساتھ ایک ایک ماہر قرآت کو بھی مقرر کردیا تھا تاکہ وہ ان نسخوں کو ٹھیک طریقے سے لوگوں کو پڑھنا سکھائے۔ مدینے میں زید بن ثابتؓ اس خدمت پر مقرر تھے۔ مکہ میں عبداللہ بن السائبؓ کو خاص طور پر اسی کام کیلئے بھیجا گیا تھا۔ شام میں مغیرہ بن شہاب، کوفے میں ابوعبدالرحمن السلمی اور بصرے میں عامر بن عبدالقیس اس منصب پر مامور کئے گئے تھے۔ ان کے علاوہ جہاں جو صحابی بھی حضور سے براہ راست یا آپ کے بعد قراء صحابہ سے قرآن کی پوری قرآت سیکھے ہوئے تھے ان کی طرف ہزارہا آدمی اس مقصد کے لئے رجوع کرتے تھے کہ قرآن کا صحیح تلفظ اور صحیح اعراب لفظ بلفظ ان سے سیکھیں۔ معلوم نہیں مودودی صاحب نے اس چوتھی بات کو جو ان کے اور بہت سے متقدمین ومتاخرین کے نزدیک تاریخ سے ثابت ہے اس کو "چوتھی تاریخی حقیقت" کہہ کر کیوں پیش نہیں فرمایا؟ مگر جب یہ تاریخ سے ثابت ہے تو یقیناً ان کے نزدیک یہ ضرور "چوتھی تاریخی حقیقت" ہے تو اس چوتھی تاریخی حقیقت کی حقیقت اگر آپ کو معلوم کرنا ہو تو میری کتاب "جمع قرآن" کے بغور مطالعہ کی زحمت گوارا کرلیجئے۔ آپ کو اس چوتھی حقیقت کی حقیقت بھی معلوم ہوجائے گی۔

---

(۱) معلوم نہیں یہ کہاں کی روایت ہے صحاح میں تو کہیں نہیں۔ مسند احمد میں بھی نہیں اور بقول ائمہ حدیث جو روایت مسند احمد میں نہیں تو اس کو ضرور جھوٹی روایت سمجھنا چاہیئے۔ غالباً "جمع القرآن" والی میری کتاب میں میرا اعتراض دیکھ کر مودودی صاحب نے اپنی طرف سے یہ بات بڑھائی ہے جس کا کوئی ثبوت وہ کسی روایت سے نہیں دے سکتے۔ حتیٰ کہ اتقان میں بھی اس کا کہیں ذکر نہیں۔ میرا اعتراض میری کتاب "جمع القرآن" میں دیکھئے۔

حقیقت یہ ہے کہ نقل مصاحف بعہد عثمانؓ والی حدیث ہو یا جمع صدیقیؓ والی، بخاری میں یا ترمذی میں یا نسائی وغیرہ میں۔ بالکل موضوع اور منافقین کی من گھڑت ہے جو صحیح بخاری و ترمذی ونسائی میں داخل کردی گئی ہے ان جامعین احادیث کی وفات کے بعد۔ جس پر مکمل بحث میری کتاب "جمع القرآن" میں موجود ہے۔ میرے اعتراضوں کا جواب میرے دلائل کی تردید آج تک کسی سے نہ ہوسکی۔ اور انشاء اللہ المستعان قیامت تک نہ ہوسکے گی۔

تاریخ کے نام پر افسانہ طرازی مودودی صاحب نے خود یا جس کتاب سے انہوں نے نقل مصاحف عثمانی کا واقعہ نقل کیا ہے اس کے مصنف نے یہ واقعہ تصنیف کیا ہے کہ حضرت عثمانؓ نے جو مملکت اسلامیہ کے مراکز میں مصاحف بھیجے تھے ہر جگہ اس مصحف کے ساتھ ایک قاری معلم بھی بھیجا تھا کہ وہ لوگوں کو صحیح تلفظ اور صحیح اعراب بتائے حالانکہ صحیح بخاری وغیرہ کتب احادیث معتبرہ میں کہیں قاریوں کے بھیجنے کا ذکر نہیں۔ صرف مصحف بھیجنے کا ذکر ہے اور ہر جگہ کے لوگوں کو یہ کہا گیا تھا کہ تم اسی نسخہ مصحف کے مطابق اپنے اپنے مصاحف کو بنالو اور جو مصحف اس کے خلاف ہو اس کو جلا دو۔ ہر جگہ کے لوگوں نے خلیفہ وقت کے حکم کی تعمیل کی بجز اہل کوفہ کے۔ اس لئے کہ حسب روایت ابن خلدون وغیرہ حضرت عبداللہ بن مسعود نے اپنے مصحف کو نہیں بدلا اور اپنے شاگردوں کو بھی تاکید کی کہ تم لوگ اپنے مصحف نہ بدلو۔ ہر شخص اپنے مصحف پر قائم رہے۔ حالانکہ یہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ پر ایک اتہام ہے وہ تو ۲۹ ھ بلکہ اس سے کچھ پہلے ہی کوفے سے

مدینے چلے آئے تھے۔۔ ۳۰ھ میں انہوں نے حضرت عثمانؓ کے ساتھ حج کیا تھا اور نقل مصاحف کا واقعہ جو کہا جاتا ہے وہ صحیح حساب سے ۳۰ھ کا ہے۔ اس وقت حضرت عبداللہ بن مسعود کوفہ میں موجود ہی نہ تھے جو اپنے شاگردوں کو کہتے کہ اپنے مصاحف کو ان کے حال پر رہنے دو۔ مصحف عثمانی کے مطابق نہ بناؤ۔ باقی رہا ابن حجر کا روایت کاذبہ کی حمایت میں یہ کہنا کہ نقل مصاحف کا واقعہ ۲۵ھ کا ہے ۳۰ھ کا نہیں تاکہ جو اقوال حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی طرف منسوب کیئے گئے ہیں وہ صحیح ثابت ہوں بالکل غلط ہے جس کو ہم "جمع القرآن" میں لکھ چکے ہیں۔

انتخاب معلمین بقول مودودی صاحب مدینے کے لئے معلم قرآن حضرت عثمانؓ نے زید بن ثابت کو مقرر کیا۔ اور مکہ کے لئے عبداللہ بن سائب کو۔ اگرچہ زید بن ثابتؓ سے زیادہ بااثر اور اعلم بالقرآن قریشی لب ولہجہ سے واقف صحابہ مدینہ میں موجود تھے ان کے ہوتے زید بن ثابتؓ کا انتخاب ہرگز مناسب نہ تھا۔ مگر چونکہ یہ کاتب وحی وکاتب مصحف صدیقی وناقل مصاحف بعہد عثمانی قرار دیئے گئے ہیں ان کی اس صحیح یا غلط شہرت کی بناء پر ان کا انتخاب غلط نہیں کہا جاسکتا ہے۔ اور عبداللہ بن سائبؓ مخزومی تھے تو مکی مگر قریشی غالباً نہ تھے۔ اس لئے کہ دو قبیلے مخزومی کہے جاتے ہیں جن میں سے ایک قریشی تھے سمعانی نے انساب میں ان کا ذکر کیا ہے اور متاخرین کے نام گنے ہیں۔ یہ تو صحابی تھے اور پھر مکہ کے قاری تھے ضرور ان کا نام بھی وہ اس ضمن میں لکھتے۔ اس کے علاوہ جو شخص مخزومی قریشی ہو اس کے نام کے ساتھ مخزومی قریشی تمیز کیلئے ضرور لکھتے ہیں۔ لیکن ان کا ان کے والد کا ان کے

خاندان کے متعدد اشخاص کا ذکر تہذیب التہذیب میں ہے لیکن کسی جگہ کسی کو بھی قریشی نہیں لکھا ہے۔ اس لئے قرنیہ غالب یہی ہے کہ یہ غیر قریشی تھے۔ بہرحال چونکہ اہل کوفہ نے جو قاریوں کا جال ہر جگہ بچھایا تھا اس کے مطابق ان کو بھی مکہ کا قاری مشہور کیا گیا تھا۔ اور مجاہد جو انہیں کے والد کے آزاد کردہ غلام تھے اور مکہ معظمہ میں کوفیوں کے ایجنٹ بھی تھے انہی مجاہد کو عبداللہ بن السائب کا شاگرد قرار دے کر ان کی طرف بھی کچھ اختلاف قرآت کی نسبت کی گئی ہے۔ اس لئے صنادید قرآت ہی نے حضرت عبداللہ بن السائب کو مکے کا قاری مشہور کیا ہے۔ مودودی صاحب نے اس کو غنیمت سمجھ کر یہ لکھ دیا کہ حضرت عثمانؓ نے ان کو اپنے مصحف کے مطابق تعلیم قرآن کیلئے مکے کا قاری مقرر کیا تھا۔ اگر واقعی زید بن ثابتؓ مدینے کے اور عبداللہ بن السائب مکے کے قاری حضرت عثمانؓ کے مقرر کئے ہوتے اور دونوں کو مصحف عثمانی ہی کے مطابق تعلیم قرآن کا حکم ہوتا تو اہل مکہ واہل مدینہ کی قرآتوں میں کوئی اختلاف نہ ہوتا۔ باقی رہے ابو عبدالرحمن السلمی یہ کوفی تھے اور حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کے شاگردوں میں سے تھے زیادہ سے زیادہ ایک تابعی تھے۔ کیا حضرت عثمانؓ کو کوئی صحابی اس وقت نہ ملتا تھا کہ ایک غیر قریشی تابعی کو تعلیم قرآن کی اہم خدمت پورے علاقے کے لئے سپرد کی؟ اور وہ بھی ایک کوفی ہی کو؟ یہی کوفی عبداللہ بن مسعودؓ کے "شاگردان رشید" تو اختلافات پیدا کررہے تھے۔ یہاں تو مدینے سے کسی خاص قریشی صحابی کو تعلیم قرآن کے لئے بھیجنا تھا تاکہ وہ اختلافات مٹائے۔ اصل یہ ہے کہ ان کو بھی کوفی ملاحدہ نے اختلافات قرآت کے لئے استعمال کیا ہے

اور ان کا نام بھی اپنے دفتر میں ٹانک لیا ہے اور کوفے کا امام القرآء بناکر مشہور کیا ہے اس لئے مودودی صاحب نے بھی ان کو حضرت عثمانؓ کا مقرر کیا ہوا قاری بنادیا۔

باقی رہ گئے دو آدمی ، مغیرہ بن شہاب جو شام کے لئے مقرر کئے گئے تھے اور عامر بن عبدالقیس جو بصرے کے لئے حضرت عثمانؓ کی طرف سے بقول موودودی صاحب مقرر کئے گئے تھے۔ یہ دونوں سرے سے صحابی ہی نہیں ہیں ۔کوئی مشہور و معروف تابعی بھی نہیں ، نہ امام ذہبی ان کا ذکر کہیں کرتے ہیں نہ ابن حجر یہ دونوں کوفے کے قاریوں کے ساختہ وپرداختہ امام القراء ہیں۔ قاریوں کے زمرے میں ان دونوں کا نام دیکھ کر ان دونوں کو بھی حضرت عثمانؓ کا مقرر کردہ قاری بنادیا۔ اس وقت تو سینکڑوں صحابہؓ موجود تھے جنہوں نے خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے قرآن پڑھا تھا۔ ایسے گمنام غیر معروفوں کا تقرر ضرور قابل لحاظ ہے۔

اس کے بعد موودودی صاحب تحریر فرماتے ہیں کہ

> ان عام معلمین قرآن کے علاوہ تابعین وتبع تابعین کے عہد میں ایک گروہ ایسے بزرگوں کا بھی پیدا ہوگیا جنہوں نے خصوصیت کے ساتھ قرآت قرآن میں اختصاص پیدا کیا یہ لوگ ایک ایک لفظ کے تلفظ طریق ادا اور اعراب کو معلوم کرنے کے لئے سفر کرکر کے ایسے اساتذہ کے پاس پہنچے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے قریب تر نسبت تلمذ رکھتے تھے اور ہر ہر لفظ کی قرآت کے متعلق یہ نوٹ کیا کہ اسے انہوں نے کس سے سیکھا ہے۔ اور ان کے استاد نے کس سے سیکھا تھا؟ اسی

مرحلہ میں یہ بات تحقیق ہوئی کہ مختلف صحابیوں اور ان کے شاگردوں کی قرآت میں کہاں کہاں اور کیا کیا اختلافات ہیں۔ ان میں سے کون سے اختلاف شاذ ہیں، کون سے مشہور ہیں، کون سے متواتر ہیں۔ اور ہر ایک کی سند کیا ہے؟ (مگر یہ اختلافات کیوں پیدا ہوئے؟ اس کی وجہ ان بزرگوں سے کسی نے نہیں پوچھی۔ تمنا) پہلی صدی کے دور آخر سے لے کر دوسری صدی تک اس طرح کے ماہرین قرآت کا ایک گروہ کثیر دنیائے اسلام میں موجود تھا۔ مگر ان میں سے خاص طور پر جن لوگوں کا کمال علم تمام امت میں تسلیم کیا گیا ہے وہ حسب ذیل سات اصحاب ہیں جو قرآء سبعہ کے نام سے مشہور ہیں۔

(۱) نافع بن عبدالرحمن المتوفی ۱۶۹ھ اپنے وقت میں مدینے کے رئیس القراء مانے جاتے تھے۔ ان کا سب سے زیادہ معتبر سلسلہ تلمذیہ تھا کہ انہوں نے حضرت عبداللہ بن عباسؓ اور حضرت ابوہریرہؓ سے پورا قرآن پڑھا تھا۔ انہوں نے ابی بن کعب سے اور انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے۔

واقعہ یہ ہے کہ سارے اختلافات قرآت کوفے کی ٹکسال میں گھڑے جاتے تھے اور پھر اپنے مراکز ان ملاحدہ کوفیوں نے بنا رکھے تھے اور ہر مرکز میں اپنے ایجنٹ مقرر کردیئے تھے پوری طرح سوچ بچار کرکہ کس اختلاف کو کس کی طرف منسوب کیا جائے اور اس کے لئے کون کون سے سلاسل اسناد جوڑے جائیں۔ جب آپس میں بات طے کرلیتے تھے تو اس

کے مطابق ان خود ساختہ اختلاف قرآت کو خود ساختہ اسناد کے ساتھ مراکز میں بھیج دیتے تھے۔ سب سے پہلے "انزل القرآن علی سبعة احرف " قرآن سات حرفوں پر اتارا گیا ہے۔" یہ حدیث گھڑی جاچکی تھی اور اس کی اشاعت بھی پوری طرح کی جاچکی تھی لیکن یہ سب بہت بعد کو کم وبیش تیسری صدی میں ہوا۔ اس سے پہلے اختلاف قرآت کا مطلق وجود ہی نہ تھا صرف سازشی مصنفین اپنی کتابوں میں کہیں کہیں بعض اختلافات کا ذکر کرجاتے تھے مگر سبعۃ احراف والی حدیث کا پرچار البتہ پہلی صدی کے اواخر یا دوسری صدی کے آغاز سے شروع ہوگیا تھا تو اب ہم ان کے قراء سبعہ جو تمام ائمہ قرآت میں سب سے زیادہ ممتاز رہے اور ہیں، کی حقیقت ناظرین پر واضح کرتے ہیں۔ نافع بن عبدالرحمن جو ان لوگوں کے نزدیک مدینہ طیبہ کے امام القراء اور سب سے بڑے قاری تھے ان کا نام اوپر آچکا ہے۔ اس لئے پہلے انہیں کا تذکرہ ہوجائے۔

قراء سبعہ کا تعارف

(۱) نافع بن عبدالرحمن بن ابی نعیم

یہ قبیلہ بنی لیث میں سے کسی شخص کے آزاد کردہ غلام تھے۔ اور بعضوں نے قبیلہ جعونہ کا غلام لکھا ہے اصفہانی تھے۔ ان کے والد ابو نعیم اور ان کے دادا کا نام عبدالرحمن تھا۔ ان کے والد اور ان کے دادا نے ساتھ ساتھ ہی اسلام قبول کیا تھا اس وقت یہ کمسن تھے۔ ان کی خود کنیت ابو رویم بھی ہے اور ابو عبدالرحمن بھی۔ ان کے دادا کا اسلامی نام لعمان رکھا گیا تھا اور ابو نعیم کنیت۔ مگر کنیت ہی سے وہ زیادہ مشہور

ہوئے۔ نافع کی نسبت کبھی باپ کی طرف کبھی دادا کی طرف کی جاتی ہے اس لئے یہ نافع بن عبدالرحمن بھی کہے جاتے ہیں اور نافع بن ابی نعیم بھی۔ حدیثیں تو یہ متعدد تابعین سے روایت کرتے ہیں مگر قرآت میں یہ اصل شاگرد ہیں عبدالرحمن بن ہرمز کے۔ اس لئے عبدالرحمن بن ہرمز کو بھی پہچان لیجئے۔ یہ لنگ کھاتے تھے اس لئے اعرج مشہور ہیں۔ ابو داؤد ان کی کنیت تھی ربیعہ بن الحارث بن عبدالمطلب الہاشمی کے غلام آزاد کردہ تھے۔ بعضوں نے محمد بن ربیعہ کا غلام لکھا ہے۔ ان کا مفصل تذکرہ تہذیب التہذیب جلد ۶، صفحہ ۲۹۰ سے صفحہ ۲۹۱ تک ہے۔ تذکرہ الحفاظ میں ہے کہ یہ کاتب المصاحف بھی تھے۔ قرآن مجید لکھا کرتے تھے۔ ۱۱۷ھ میں وفات پائی۔ ابو عمر الدانی جو مشہور امام قرآت ہیں ان کا قول تہذیب التہذیب میں نقل کیا ہے کہ انہیں سے نافع بن ابی نعیم نے قرآن کی قرآت زبانی سن کر حاصل کی تھی۔ عبدالرحمن بن ہرمز کے والد کا نام اسلام قبول کرنے کے بعد کیسان رکھا گیا تھا۔ اس لئے ان کو لوگ کہیں عبدالرحمن بن کیسان بھی کہتے ہیں بعضوں نے ان کا سال وفات ۱۱۰ھ لکھا ہے۔ غرض یہ بھی موالی ہی میں سے تھے۔ یہ متعدد صحابہؓ سے حدیثیں روایت کرتے ہیں اور ان سے متعدد محدثین حدیثیں لیتے ہیں مگر اس کا کوئی ذکر نہیں کرتا کہ انہوں نے کس سے قرآن پڑھا تھا؟ اور نہ یہ کوئی لکھتا ہے کہ نافع بن عبدالرحمن بن ابی نعیم کے سوا کیا اور بھی کسی نے ان سے قرآن پڑھا تھا؟ اگر اور بھی کسی نے ان سے قرآن پڑھا تھا تو وہ کون صاحب ہیں؟

ابوحمہ محمد بن یوسف جو تقریباً ایک مجہول الحال شخص ہیں وہ ابو قرۃ

موسیٰ بن طارق سے روایت کرتے ہیں کہ نافع بن ابی نعیم کہتے تھے کہ میں نے ستر تابعین سے قرآن کی قرآت اخذ کی ہے۔ کاش ان ستر میں سے صرف سات کے نام ہی وہ بتادیتے۔ اس لئے کہ ان کی قرآت کی روایتیں جتنی ہیں تقریباً سب انہیں ابن ہرمز ایک غلام آزاد کردہ ہی سے ہیں۔ حدیثیں البتہ وہ اوروں سے روایت کرتے تھے۔ ابن حجر احادیث میں ان کے شیوخ کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں و لنافع عن الاعرج نفسه مائة حديث اخرئ و عنه اخذ القراءة- اور نافعؔ کے پاس (عبدالرحمن بن ہرمز) اعرج سے خاص ان سے سو حدیثیں دوسری تھیں۔ (یعنی جو اور شیوخ سے ان کو نہ ملی تھیں) اور انہیں سے نافع نے قرآۃ حاصل کی تھی۔ عنہ کے لفظ کا جملے سے پہلے آنا مفہوم حصر پیدا کرتا ہے۔ اس کو ادب عربی کے ابتدائی درجوں کے طلبہ بھی جانتے ہیں۔ جس سے صاف ظاہر ہے کہ نافع کو قرآت کے اختلافات کی واقفیت صرف عبدالرحمن بن ہرمز اعرج ہی سے حاصل ہوئی تھی اور نافع نے قرآن کی قرآتوں کو صرف انہیں سے پڑھا تھا۔ دیکھئے تہذیب التہذیب جلد ۱۰ صفحہ ۴۰۸،۴۰۷ مگر اس حصر کے معنیٰ یہ نہیں ہیں کہ اور کسی سے انہوں نے قرآت کا فن حاصل ہی نہیں کیا۔ یہ حصر ان کے ان شیوخ کے مقابلے میں ہے جن کا ذکر ابن حجر نے تہذیب التہذیب میں ان کے ترجمے میں پہلے کیا۔ جو صحابہؓ کی اولاد یا اکابر تابعین تھے جن سے صرف حدیثیں انہوں نے لی تھیں۔ وہ لوگ بے چارے اختلافات قرآت سے کیا واقف جو ان سے قرآت کا فن سیکھتے۔ اس کے ماہرین تو صرف عجمی لوگ تھے جو عرب کے آزاد کردہ غلام تھے۔ جن کا اصل مرکز کوفہ تھا۔ مدینے کے قدیم باشندے جو عہد نبوی سے

مدینے میں رہے یا صحابہ کی اولاد میں سے جو مدینے ہی میں پیدا ہوئے یا وہ موالی جو سچے مخلص مسلمان تھے اور جس خاندان سے متعلق ہوئے ان کے ہو کے رہے۔ ان غریبوں کو تو اختلافات قرآت کا کچھ علم تھا ہی نہیں۔ اس لئے جن کا ذکر ابن حجر نے پہلے کیا ہے یہ حصر صرف انہی لوگوں کے مقابل ہے۔ ورنہ بعض دوسرے آزاد کردہ غلاموں سے بھی نافع نے قرآت کا فن حاصل کیا تھا جیسا کہ ابن حجر تہذیب التہذیب جلد ۱۱، صفحہ ۳۲۵ یزید بن رومان الاسدی ابو روح المدنی آل زبیر کے غلام آزاد کردہ کے ترجمہ کے آخر میں لکھتے ہیں کہ انہوں نے عبداللہ بن عباس بن ابی ربیعہ سے قرآن پڑھا تھا اور ان سے نافع بن ابی نعیم نے قرآن کا علم حاصل کیا تھا مگر یہ عبداللہ بن عباس بن ابی اربعہ کون تھے؟ اس کا پتہ نہ ملا کیونکہ حضرت عبداللہ بن عباس بن عبدالمطلب رضی اللہ عنہما تو ہو نہیں سکتے۔ اور ابن ابی ربیعہ کا پتہ کہیں نہیں ملتا۔ اگر یہ کہا جائے کہ " ابن ربیعہ " کا لفظ غلط ہے غلطی سے اتنا اضافہ طباعت میں ہوگیا ہے۔ مراد حضرت عبداللہ بن عباس ہی ہیں۔ تو یقیناً ان سے صرف قرآن ہی یہ نہ پڑھتے وہ تو حدیثوں کے بحر ذخار تھے جس طرح اوروں سے حدیثیں سنی تھیں اسی طرح ان سے حدیثوں کے سننے کا ذکر کرنے کے بعد لکھا جاتا کہ اقراء علیہ القرآن یعنی اور ان سے قرآن بھی پڑھا تھا۔ جب ایسا نہیں ہے ان سے صرف قرآن ہی پڑھا تھا تو یقیناً یہ عبداللہ بن عباس بن ابی ربیعہ کوئی غیر معروف مجہول الحال شخص ہیں جن سے ائمہ رجال بالکل بے خبر ہیں اور موالی ہی قسم کے ہیں جو کوفیوں کی طرف سے صرف اختلافات قرآت کے ایجنٹ تھے۔ کوفے کے مرکز سے نافع بن ابی نعیم کے پاس

بھیجے گئے تھے۔ واللہ اعلم ۔ بہرحال نافع کے یہ استاد یزید بن رومان بھی آل زبیر کے غلام آزادہ کردہ ہی تھے۔ اور انہوں نے خود بھی قرآن ایک مجہول الحال ہی شخص عباس بن ربیعہ کے بیٹے عبداللہ سے پڑھا تھا۔ اور ان سے صرف نافع صاحب نے قرآن کی قرآت کا علم حاصل کیا۔

مودودی صاحب کی "علمی وتاریخی تحقیق"

مودودی صاحب اپنے اس زیر تنقید مضمون شائع شدہ ترجمان القرآن جلد ۵۲، عدد ۳ کے صفحہ ۱۷۷ میں نافع بن عبدالرحمن بن ابی نعیم کے متعلق خود تحریر فرماتے ہیں " متوفی ۱۶۹ ھ " پھر لکھتے ہیں کہ

" ان کا سب سے زیادہ معتبر سلسلہ تلمذیہ تھا کہ انہوں نے حضرت عبداللہ بن عباس اور حضرت ابو ہریرہؓ سے پورا قرآن پڑھا۔ " الخ

حضرت عبداللہ بن عباس کی وفات ۶۹ ھ میں اور حضرت ابوہریرہؓ کی وفات ۵۷ ھ میں ہوئی تھی ۔ نافع اور حضرت ابن عباس کی وفات کے درمیان پورے سو برس کا فاصلہ اور نافع اور حضرت ابوہریرہؓ کی وفات کے درمیان ایک سو سے بھی دو برس فاضل کا فاصلہ تھا۔ نافع کی عمر اگر کوئی غیر معمولی لمبی ہوئی تو ائمہ رجال ضرور اس کو لکھ دیتے۔ جیسا کہ عموماً معمر راویان احادیث کی عمریں لکھ یاد کرتے ہیں۔ صحیح طور سے تعین نہیں کر سکتے جب بھی اتنا ضرور لکھ دیتے ہیں کہ انہوں نے سو سے زیادہ عمر پائی تھی۔ یا اس کے نام کے ساتھ " معمر " کا لفظ لکھ دیتے ہیں جس طرح نافع ہی کے شاگرد کے شاگرد مسطوعی کو " معمر " لکھا ہے اور ان کی عمر ایک سو دو برس بتائی ہے۔ نافع صاحب کی عمر کم از کم ۱۲۵

برس کی ہو جب کہیں یہ بات مانی جاسکتی ہے کہ نافع نے ان دونوں بزرگوں سے قرآن مجید پڑھا۔ مگر نافع کی اتنی بڑی غیر معمولی عمر ثابت کرنا ناممکن ہے۔

لیکن آج مودودی صاحب ہی یہ دعویٰ کررہے ہیں کہ نافع بن عبدالرحمن نے حضرت عبداللہ بن عباسؓ و حضرت ابوہریرہؓ سے پورا قرآن پڑھا تھا۔ مودودی صاحب کے سوا کسی شخص نے بھی اس کا دعویٰ نہیں کیا۔ ائمہ رجال اپنی کتابوں میں نافع کا ترجمہ لکھتے ہیں مگر کسی نے بھی تو نہیں لکھا ہے جو مودودی صاحب فرمارہے ہیں۔ تو کیا علمی و تاریخی تحقیق کا ایک اصول یہ بھی ہے کہ کوئی بات جی سے گھڑکر لکھ دی جائے؟ غرض یہ ثابت ہوگیا کہ مدینے میں نافع بن عبدالرحمن کوفیوں کے ایک ایجنٹ تھے جو چپ چاپ وہاں بٹھا دیئے گئے تھے کہ اکابر تابعین کے سامنے بیٹھ کر ان سے صرف حدیثیں سنا کرتے تھے تاکہ ان کے آگے اپنا رسوخ قائم رہے۔ قرآن انہوں نے ان اکابرین تابعین سے کبھی نہیں حاصل کیا۔ قرآت کے متعلق جو کچھ ذخیرہ ان کو ملا وہ اپنے جیسے آزاد کردہ غلاموں سے ملا یعنی اعرج (عبدالرحمن بن ہرمز) سے یا یزید بن رومان الاسدی سے۔ یہ خود بھی ایک آزاد کردہ غلام تھے اور ان کے دونوں استاد بھی آزاد کردہ غلام ہی تھے اور یہ تینوں عجمی الاصل تھے۔ اور اختلافات قرآت کی سازشی انجمن کے ارکان اولی و خصوصی تھے۔ جو مدینے میں تو خاموش تھے مگر باہر ان کو مدینے کا قاری مشہور کیا گیا تھا۔ ورنہ مدینے میں جس کو قرآن پڑھنا تھا وہ صحابہؓ کی اولاد اور اکابر تابعین کو چھوڑکر ان عجمی غلاموں سے قرآن کیوں پڑھتا؟ کیا کوئی بتا سکتا ہے کہ صحابہؓ کی اولاد

یا اصاغر تابعین ہی میں سے جو عجمی الاصل نہ تھے ان میں سے کتنے لوگوں نے نافع صاحب اور ان کے دونوں استادوں سے قرآن پڑھا تھا؟ ھاتوا برھانکم ان کنتم صادقین

باقی ابو حمہ یمانی کا ابو قرۃ یمانی سے یہ روایت کرنا کہ ابو قرۃ سے نافع بن عبدالرحمن نے کہا تھا کہ میں نے ستر تابعیوں کے سامنے قرآن پڑھا ہے معلوم نہیں کہاں تک صحیح ہے۔ ابو حمہ محمد بن یوسف الیمانی صرف ابو قرہ موسیٰ ابن طارق الیمانی ہی سے حدیثیں روایت کرتے ہیں۔ قاری نہ وہ ہیں نہ یہ۔ ابو قرہ نے نافع عبدالرحمن سے صرف کچھ حدیثیں فقط سنی تھیں۔ ان سے ابو قرہ نے بھی قرآن نہیں پڑھا تھا۔ اور نہ ابن حجر تہذیب التہذیب جلد ۱۰، صفحہ ۳۴۹ میں ابو قرۃ کا ترجمہ لکھتے ہوئے جہاں روی عن فلاں فلاں کے ساتھ " نافع بن ابی نعیم " لکھا ہے وہاں ان کے بعد " وقراء علیہ القرآن " بھی ضرور لکھتے جس طرح نافع کے ترجمے میں روی عن فلاں فلاں کے ساتھ اعرج کا ذکر کیا ہے تو چند ہی سطروں کے بعد و اخذ عنہ القرآن کہہ کر تصریح کر دی ہے۔ اس لئے کہ روی عن فلاں سے صرف روایت حدیث ہی سمجھی جائے گی۔ قرآت قرآن اس سے کوئی جاہل بھی نہیں سمجھ سکتا۔ اور کہا جاسکتا ہے کہ نافع نے ایک یمنی کے سامنے تنہائی میں یہ دعویٰ کر دیا ہوگا کہ وہ تسلیم کرلے گا۔ کسی مدنی کے سامنے بھی اگر ایسا کہتے تو معلوم ہوتا۔ یا کسی مجمع میں کہتے۔

اور ابن وہب کی یہ روایت کہ لیث بن سعد کہتے تھے کہ ادرکت اھل المدینۃ و ھم یقولون قراءۃ نافع سنۃ یعنی لیث بن سعد کہتے تھے کہ " میں نے اہل مدینہ کو یہ کہتے ہوئے پایا کہ نافع کی قرآت سنت

ہے ۔ یعنی عہد نبوی سے اس وقت تک برابر سارے صحابہؓ و تابعین اسی کے مطابق پڑھتے آئے۔ مگر اگر ایسا ہو تو بھی کہنا یہ تھا کہ نافع کی قرآت وہی ہے جو قرآت مسنونہ ہے۔ کیونکہ نافع نے سو سے کچھ زیادہ بھی بالفرض عمر پائی ہو تو انہوں نے عہد خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم بھی نہیں دیکھا تھا۔ اگر اس وقت وہی قرآت پڑھی جاتی تھی جس کو نافع نے اختیار کیا تھا تو کیا اس وقت کے لوگ اس کو "نافع کی قرآت" ہی کہہ کر پڑھتے اور سمجھتے تھے؟ جو قرآت نافع کی پیدائش کے قبل سے جاری ہو اس کو نافع کی طرف منسوب کرنا تو اس قرآت کی توہین کرنا ہے مگر واقعہ اس کے خلاف ہے اس لئے کہ نافع کی پیدائش کے قبل کے لکھے ہوئے مصاحف اس وقت بھی موجود ہیں۔ حضرت عثمانؓ ، حضرت علیؓ اور بعض دوسرے صحابہ یا اکابر تابعین کے مخطوطات ، مگر ان میں سے ایک بھی نافع کی قرآت کے مطابق نہیں ہے۔ اس لئے یہ خلاف واقعہ بات ابن وہب (عبداللہ بن وہب المصری) نے لیث بن سعدالمصری کی طرف منسوب کرکے کیوں کہی؟ اور اگر واقعی لیث ہی نے ایسی بات جو بالکل خلاف واقعہ تھی ابن وہب سے کہی تھی تو کیوں کہی تھی؟ اس کی وجہ ظاہر ہے کہ عبداللہ بن وہب بھی قریش کے موالی میں سے تھے اور لیث بن سعد بھی ۔ یہ دونوں قریش کے آزاد کردہ غلام تھے اور نافع بھی غلام تھے۔ اور نافع کے دونوں استاد بھی غلام تھے اور یہ سب عجمی تھے اور اختلاف قرآت کی تحریک ان غلاموں کی چلائی ہوئی تھی۔ عبداللہ بن وہب کی پیدائش ۱۲۵ھ کی تھی اور وفات ۱۹۷ھ میں ، اور لیث بن سعد کی پیدائش ۹۴ھ میں اور وفات ۱۷۵ھ میں۔ دونوں ہی اصفہانی الاصل

تھے اور نافع بھی اصفہانی الاصل تھے۔ ابن وہب نے نافع کی قرآت کو رواج دینے کے لئے لیث کی طرف منسوب کرکے اس کی کوشش کی کہ مصر میں نافع کی قرآت جاری ہو اور مصر والے جو قرآت متواترہ مسنونہ پڑھ رہے ہیں اس کو حفص بن سلیمان الکوفی کی قرآت سمجھ کر چھوڑ دیں۔ مگر قرآن کی حفاظت کا وعدہ الہٰی ایسا نہیں ہے کہ قرآن کے کسی ایک نقطے یا اعراب کو بھی ادھر ادھر ہونے دے۔ اس لئے باوجود اتنے پروپیگنڈے اتنی جدوجہد اور ایسی گہری سازش کے بھی نہ مصر میں نافع کی قرآت چل سکی نہ مدینے میں اور نہ دنیا کے کسی حصے میں۔

و اللہ غالب علی امرہ و لکن اکثر الناس لایعلمون ۞ (۲۱:۱۲)

اسی طرح بعض اکابر امت کی طرف جو نافع کی قرآت کی تعریف منسوب کی گئی ہے وہ یقیناً غلط منسوب ہے اور کسی کی طرف اگر نسبت صحیح کی گئی ہے تو اس کا قائل ضرور اسی طبقے کا ہوگا۔ البتہ متاخرین چونکہ فریب خوردہ تھے۔ اور وہ اختلاف قرآت کے دام تزویر میں پھنس چکے تھے اس لئے متاخرین جو کچھ بھی اختلاف قرآت یا کسی خاص قاری کی تعریف کریں وہ قابل اعتبار واستناد نہیں۔

قالون نافع بن عبدالرحمن کے تلامذہ جن کے ذریعے وہ قرآتیں بعد والوں کو ملی ہیں جو نافع کی طرف منسوب کی جاتی ہیں وہ صرف دو ہی ہیں جیسے ان کے استاد قرآن صرف دو تھے۔ باوجود اس کے کہ حدیثوں کے شیوخ خود نافع کے بھی دس بارہ سے زیادہ ہی ہیں اور ان کے ان دونوں تلامذہ کے شیوخ بھی نافع کے سوا بہت ہیں جن سے وہ دونوں حدیثیں

روایت کرتے تھے۔ غرض قرآن اور اس کی قرآتوں کی روایت کرنے والے صرف وہی آدمی ان کو ملے۔ (کیونکہ سازش کی راز داری اور من مانی خودساختہ قرآتوں کی رازدارانہ اشاعت کی پوری ذمہ داری لینے والوں کو ہی وہ اپنا شریک کار بناسکتے تھے) ایک تو عیسیٰ بن مینار جن کا لقب قالون ہے۔ تہذیب التہذیب جو صحاح کے راویوں کی کتاب ہے اس میں ان کا ذکر نہیں ہے۔لسان المیزان جو خاص کرکے ضعیف و مجروح راویوں کی کتاب ہے اس میں ابن حجر نے ان کا ذکر کیا ہے۔ یہ تو نہیں مگر ان کے والد مسور بن مخرمہ رضی اللہ عنہ کے غلام آزاد کردہ تھے۔ احمد بن صالح المصری سے کسی نے پوچھاکہ ان کی حدیثیں کیسی ہیں؟ تو وہ ہنسے اور کہنے لگے کہ تم ہر کس وناکس سے حدیث لے لیا کرتے ہو۔ مگر چونکہ بخاری میں ان کی حدیث موجود ہے اس لئے ان کے متعلق اس سے زیادہ ابن حجر نہیں لکھ سکے بلکہ توثیق کی کوشش کی ہے۔

ورش دوسرے راوی قرآت جو نافع کو ملے وہ ورش کے لقب سے مشہور ہیں جن کا ذکر ابن حجر نے کہیں نہیں کیا۔ ان کا پورا نام ابوسعید عثمان بن سعید ہے۔ یہ قبطی تھے مگر قریشیوں کے آزاد کردہ غلام تھے سیلئے قریشی کہے جاتے ہیں۔ ۱۹۷ھ میں وفات پائی۔ تو نافع بن عبدالرحمن بن ابی نعیم صاحب جو مدینے کے امام القرآء قرار دیئے گئے ہیں دونوں غلام - یہ خود غلام - ان کے دونوں شاگرد غلام، اور اس وقت کے اکابر بلکہ اصاغر مدینہ میں سے بھی کسی ایک شخص نے بھی ان سے قرآت حاصل نہیں کی۔ یہ صرف مدینے میں بیٹھے رہتے تھے اور کوفے والے ان کا پروپیگنڈہ کرتے تھے کہ یہ مدینے کے قاری ہیں۔ بلکہ یہ پروپیگنڈہ ان کی

وفات کے بعد سے شروع ہوا اور ان کو مدینے کا قاری اور امام القراء ان کے مرنے کے بعد مشہور کیا گیا اور وہ بھی سو ڈیڑھ سو برس کے بعد بلکہ کچھ اور مدت کے بعد، نافع بے چارے تو مدینے کے معمولی لوگوں میں سے تھے ان کی کوئی اہمیت وہاں نہ تھی ورنہ مدینے میں کتنے تاریخی واقعات ہوئے ان کا یا ان کے والد ماجد کا کسی موقع پر بھی کوئی ذکر تاریخی کتابوں میں ضرور آتا۔ نافع غریب کی وفات کے کم سے کم سو برس کے بعد ان کے سر پر مدینے کے امام القراء ہونے کی پگڑی باندھی گئی ہے اور قالون اور ورش جیسے گمناموں کو ان کا جانشین بنایا گیا۔ اور غالباً یہ دونوں بھی اپنے مرنے کے بعد ہی نافع کے جانشین بنے ہوں گے۔ اس لئے کہ اختلاف قرآت کا بازار لگایا گیا ہے چوتھی صدی کے اواخر میں اس سے پہلے بازار نہیں لگایا گیا تھا۔ کوفے میں بیٹھے یاران طریقت بازار کا نقشہ بنارہے تھے اور حضرت عبداللہ بن مسعودؓ پر جو یہ تہمت رکھی گئی تھی کہ جب حضرت عثمانؓ کا بھیجا ہوا قرآن کوفے میں پہنچا تو انہوں نے اپنے شاگردوں کو اس کے قبول کرنے سے منع کیا اور اختلافات کو باقی رکھنے کی تاکید کی۔ اس لئے مختلف مصحف عبداللہ بن مسعودؓ، مصحف ابی ابن کعب مصحف سعد بن ابی وقاص وغیرہ سب کوفے ہی میں ان لوگوں کے نام سے بنالئے گئے تھے ابن جریر طبری کی وفات ۳۱۰ ھ میں ہوئی اور ان کی زندگی تک اختلاف قرآت کا وجود نہ تھا اس وقت عجمیوں اور موالی قسم کے لوگوں نے صرف انزل القرآن علی سبعۃ احراف کا ڈھول پیٹنا کافی سمجھا تھا اور چھ قرآتوں کے غائب ہوجانے کی وجہ یہ بتاتے تھے کہ حضرت عثمانؓ نے امت کو قرآن میں اختلاف سے بچانے کے لئے چھ قرآتوں کو ترک کرادیا

تھا اور ضائع کرادیا اور صرف ایک قریش کی قرآت کو باقی رکھا - اس لئے حضرت عثمان کے حکم سے چھ قرآتیں مٹا دی گئیں اور ایک ہی قرآت باقی رہی تو اب ان چھ قرآتوں کو تلاش کرنا غلط ہے۔ چنانچہ ابن جریر طبری اپنی تفسیر کے مقدمہ میں صفحہ ۲۵ پر لکھتے ہیں۔ " اگر کوئی پوچھے کہ تم کس کتاب اللہ میں ایسے حروف واحدہ ومفردہ پاؤ گے جو سات مختلف لغات سے پڑھے جاتے ہوں مگر معنیٰ میں متفق ہوں تو ہم تمہارے اس سوال کی صحت کو تسلیم کرتے ہیں اور اس کا جواب یوں دیتے ہیں کہ ہم نے یہ دعویٰ[1] کب کیا کہ وہ آج موجود ہیں۔ ہمیں تو صرف خبر دی گئی تھی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو یہ فرمایا تھا انزل القرآن علی سبعة احرف اس کے معنیٰ کیا کیا ہیں جو اخبار میں وارد ہیں، جس کا ذکر ہم[2] نے پہلے کیا۔ نہ وہ جو ہمارے مخالفین[3] اس کے بارے میں کہتے ہیں

(۱) اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ جو ایک قرآت مخصوصہ ابن جریر کی طرف بھی منسوب کی جاتی ہے وہ بھی ابن جریر کی طرف ان کی وفات کے بعد بناکر منسوب کی گئی ہے- ابن جریر خود اس کے ذمہ دار نہیں۔

(۲) ابن جریر نے اس مقدمہ تفسیر میں اکاون طرق سے اس حدیث موضوع انزل القرآن علی سبعة احرف کی روایت اور اس کے معانی بھی اسی ضمن میں جو مروی ہیں لکھے ہیں- میں نے ان کی بھی تنقید کی ہے- مگر طوالت کے خوف سے اس کو اعجازالقرآن کی دوسری جلد کے لئے اٹھا رکھتا ہوں۔

(۳) ابن جریر کے مخالفین کون لوگ تھے جن کے نزدیک اختلافات موجود تھے- یہ وہی کوفے والے تھے جن سے ابن جریر کو اتفاق نہ تھا، ورنہ اور کون ہوسکتا ہے جن کو ابن جریر اختلاف قرآت کے متعلق اپنا مخالف کہیں- ابن جریر کے نزدیک سبعہ احرف میں سے چھ حروف باقی نہ رہے اور مخالفین کے نزدیک وہ سب باقی ہیں- ابن جریر نے انہیں کی تردید کی ہے اور وجوہات تردید اس سے پہلے بیان کی گئی ہیں۔

ان وجوہات کی بناء پر جس کو ہم نے پہلے بیان کیا تو اگر کہا جائے کہ پھر وہ چھ حروف جو اترے تھے ان کی عدم موجودگی میں ان کا کیا حال ہوگا۔ تم نے خود ان کی حدیثیں پیش کیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو خود پڑھا تھا اپنے صحابہ کو پڑھایا تھا۔ ان کو ان قرآتوں کے مطابق پڑھنے کا حکم فرمایا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے ان سب قرآتوں کو اپنے نبی پر اتارا تھا کیا وہ چھ قرآتیں منسوخ ہوگئیں یا اٹھ گئیں۔ تو ان کے منسوخ یا مرفوع ہو جانے کی کیا دلیل ہے؟ یا امت ان کو بھول گئی۔ اگر ایسا ہے تو ایک مامور یہ چیز کا ضائع کر دینا ہے۔ جس کی حفاظت کا حکم تھا آخر اس مسئلے میں کون سا قول فیصل سمجھا جائے؟

تو اس کا جواب یہ دیا جائے گا کہ وہ نہ چھ قرآتیں منسوخ ہوئیں نہ مرفوع ہوئیں اور نہ امت ان کو بھولی۔ باوجود اس کے کہ وہ ان کے حفظ پر مامور تھی۔ اصل یہ ہے کہ امت حفظ قرآن پر مامور تھی اور اس کو یہ آزادی دی گئی تھی کہ ان سات قرآتوں میں سے جس قرآت پر بھی چاہے پڑھے، حفظ کرے۔ جس طرح کوئی شخص قسم کھا کر توڑ دے تو اس کو یہ اختیار ہے کہ تین کفاروں میں سے جس کفارے کو چاہے ادا کرے،

---

(۱) معلوم ہوتا ہے کہ کوفے کے یہ ملاحدہ ابن جریر کے پاس پہنچے تھے یہ سمجھ کر کہ یہ بھی عجمی ہیں اور شیعہ بھی ہیں یہ ضرور ہمارے ساتھ ہو جائیں گے۔ مختلف مصاحف انہوں نے تیار کر رکھے تھے وہ دکھائے تھے یا ان کا ذکر کیا تھا اور عبداللہ بن مسعودؓ کے منع کرنے کا بھی ذکر کیا ہے کہ انہوں نے مصحف عثمانی کی اتباع کرنے سے منع کیا اور ہم لوگوں کو اپنے اپنے مصحف پر قائم رہنے کی تاکید کی، مگر ابن جریر ہزار شیعہ سہی۔ عجمی سہی، مگر موالی میں سے نہ تھے اور نہ ان ملاحدہ کی طرح ملحد تھے۔ اس لئے ان کے دام میں نہ آئے۔ ابن جریر نے ان کو اپنا یعنی مسلمانوں کا مخالف قرار دے کر ان کا ذکر کیا۔

چاہے غلام آزاد کرے، چاہے دس مسکینوں کو کھانا کھلادے یا کپڑے پہنادے۔ تو ان تین کفاروں میں سے جس کفارے کو بھی وہ ادا کرے گا اللہ کے حق سے اس بارے میں سبکدوش ہوجائے گا۔ اسی طرح امت کو یہ اختیار دیا گیا تھا کہ وہ ان سات حرفوں میں سے جس حرف پر بھی چاہے قرآن کو پڑھے اور یاد کرے۔ امت پر واجب تھا کہ سات حرفوں میں سے کسی ایک حرف پر بھی ثبات رکھے تو جب ایک حرف کے مطابق امت پڑھنے لگی تو باقی حروف خود بخود ترک ہوگئے۔ تو اگر پوچھا جائے کہ وہ کون سا باعث تھا کہ امت ایک حرف پر ثابت ہوگئی اور دوسرے چھ حروف ساری امت سے بالکل ترک ہوگئے؟ تو اس کی وجہ یہ ہے۔"

اس کے بعد ابن جریر نے جمع قرآن بعہد صدیقؓ کی روایت پھر نقل مصاحف بعہد عثمانیؓ کی روایت نقل کرکے یہ ثابت کیا ہے کہ جب حضرت عثمانؓ نے بتقاضائے مصلحت صحابہؓ کے مشورے سے اختلافات فی القرآن کی کثرت دیکھی تو صرف لغت قریش پر قرآن کو باقی رکھا اور باقی حروف کی چھ قرآتوں سے امت کو روک دیا اور ایسے مصاحف کو جو دوسری قرآتوں کے مطابق لکھے ہوئے تھے ضائع کرادیا۔ اس لئے چھ قرآتیں دنیا سے ناپید ہوگئیں اور ہر جگہ صرف ایک ہی قرآت کا مصحف ہمیں ملتا ہے۔

ابن جرید کی اس تصریح سے صاف ظاہر ہے کہ ان کے وقت تک اختلافات قرآت کے سات اسکول نہیں قائم ہوئے تھے اور قرآتوں کا بازار نہیں لگا تھا۔ صرف کوفے کے متعدد گھروں میں چپکے چپکے افسانہ اختلاف قرآت کی کھچڑی پک رہی تھی اور دسترخوان پر صرف موالی۔ قسم

کے ایسے لوگ جو ان کے دام میں آچکے تھے یا آ سکتے تھے وہی بٹھائے جاتے تھے۔ مگر اسکول کا نقشہ کاغذ پر ضرور بن گیا تھا اور اپنا ایک آدمی ہر اسکول میں رکھ دیا گیا تھا۔ مگر جہاں وہ اسکول بنا تھا وہاں کے لوگ مدت تک اس اسکول سے کچھ واقف نہ ہوتے اور جو ہیڈ ماسٹر اسکول کا ہوتا وہ ایک طالب علم کی طرح وہاں کے محدثین کے پاس جاکر صرف حدیثیں سنا کرتا تھا۔ اس کا اسکول کوفے کے دارالندوہ میں ایک کاغذ پر ہوتا تھا۔ یہاں کچھ دنوں رہ کر ہر ہیڈ ماسٹر کو چپکے چپکے رازدارانہ اسکول چلانے کا طریقہ معلوم کرلینا پڑتا تھا۔

مختصر یہ کہ نافع صاحب کو ہمراز صرف دو شاگرد اختلاف قرآت کے ملے ایک تو قالون عیسیٰ بن مینا جو بالکل نپٹ بہرے تھے، پڑھنے والوں کے لبوں کی حرکت سے تلفظ کا اندازہ لگا کر تعلیم دیتے تھے۔ جیسا کہ ابن حجر نے لکھا ہے۔ دوسرے ورش ابو سعید عثمان بن سعید۔ قالون کے بھی دو شاگرد قرار دیئے گئے۔ ابو نشیط اور حلوانی۔ اسی طرح ورش کے بھی دو شاگرد ازرق اور اصبہانی۔ پھر ابو نشیط کا ایک شاگرد ابو بکر مگر اس کے دو شاگرد ابن بویان اور قراز اور حلوانی کے دو شاگرد ابن مہران اور جعفر بن محمد اور ازرق کے دو شاگرد اسماعیل النحاس اور ابن سیف اور اصبہانی کے بھی دو شاگرد ابن جعفر اور مطوعی۔ تو خیال فرمائیے تین دن مسہل سے پہلے تین منضج مسہل کے بعد تین مسہل، تین تبریدیں۔ یہ سب کے دن ہوئے؟ نافع کے دو استاد پھر نافع کے دو شاگرد تک تو آپ ایک حد تک جان گئے۔ اب ہر شاگرد کے دو شاگرد اور پھر ہر شاگرد کے دو شاگرد۔ ان اٹھارہ آدمیوں کے حالات پر بحث آسان نہیں۔ خصوصاً جب ان میں سے

بہتیرے مجہول الحال ہیں۔ دنیائے رجال میں جن کا کوئی ذکر نہیں اور جہاں ذکر ہے وہاں اس سلسلہ اسناد کے خلاف مذکور ہے۔ مثلاً حلوانی کو یہاں قالون کا شاگرد بتایا ہے مگر لسان المیزان جلد ا صفحہ ۲۲۷ میں ان کے استاد قرآت کا کہیں ذکر نہیں۔ ان کے صرف ایک شاگرد قرات کا ذکر ہے وہ ان دو میں سے کوئی بھی نہیں جن کو اس سلسلے میں ان کا شاگرد بتایا گیا ہے بلکہ ایک تیسرے شخص ابوالکرم شہزداری کو لکھا ہے۔ ان کا سال وفات ۵۰۷ھ ہے۔ اسی طرح اصبہانی کو ورش کا شاگرد بتایا ہے مگر لسان المیزان جلد ۴، صفحہ ۴۷۰ میں ان کو کیسائی کا شاگرد لکھا ہے۔ ورش کا ذکر تک نہیں۔ اسی طرح مطوعی حسن بن سعید بن جعفر المعمر نے ایک سو دو برس کی عمر پائی تھی۔ انہوں نے ابن مجاہد اور اسحاق بن احمد الخزاعی سے قرآن پڑھا تھا۔ کسی اصبہانی کا شاگرد ان کو نہیں لکھا ہے۔ یہ لوگ بغیر ناموں کی تصریح کے قصداً حقیقت حال کو چھپانے کے لئے صرف کنیت یا لقب وغیرہ لکھ کر اشخاص کو نقاب پوش بنادیتے ہیں تاکہ ان کی شخصیت معلوم نہ ہو۔ انشاء اللہ آئندہ ان اشخاص پر روشنی ڈالی جائے گی۔ مگر سردست نافع، ان کے دونوں شیخ اور ان کے دونوں شاگردوں کا حال ہی حقیقت حال کے سمجھنے کے لئے کافی ہے۔

قیاس کن زگلستان من بہار مرا

(۲) عبداللہ ابن کثیر قاری مکہ

عبداللہ بن کثیر الداری المکی ابو سعید القاری مولی عمرو بن علقمۃ الکنانی۔ مکہ مکرمہ میں یہ عطر فروشی کرتے تھے۔ اہل مکہ عطر فروش کو

داری کہتے تھے۔ بعضوں نے لکھا ہے کہ نہیں۔ بلکہ وہ تمیم کی ایک شاخ داری بن ہانی کی اولاد میں سے تھے۔ اس لئے ان کو الداری کہتے ہیں۔ واللہ اعلم بالصواب۔ بہرحال یہ علقمۃ الکنانی کے بیٹے عمرو کے آزاد کردہ غلام تھے۔ ابو الزبیر المکی سے حدیث روایت کرتے تھے اور مجاہد بن جبیر سے بھی اور انہیں سے قرآن بھی پڑھا تھا اور ابوالنہال عبدالرحمن بن مطعم سے اور عکرمہ حضرت ابن عباس کے آزاد کردہ غلام سے بھی حدیثیں روایت کرتے تھے۔

صرف ابو عمرو الدانی نے کہا ہے کہ انہوں نے قرآت حاصل کی تھی۔ عبداللہ بن السائب المخزومی سے مگر مشہور یہ ہے کہ انہوں نے مجاہد بن جبیر سے قرآت سیکھی تھی۔ امام بخاری نے بھی یہی لکھا ہے کہ عبداللہ بن کثیر المکی نے قرآت مجاہد سے حاصل کی تھی۔

ایک صاحب عبداللہ بن کثیر بن المطلب بن وداعۃ السہمی بھی تھے اور دونوں ہمعصر تھے مگر سہمی فقط محدث تھے اور داری مکہ مکرمہ کے قاری مقرر کئے گئے تھے۔ ائمہ رجال نے دونوں کے بعض حالات میں خلط ملط کردیا ہے۔ ابن ابی مریم ابن معین کا قول روایت کرتے ہیں کہ عبداللہ بن کثیر الداری القاری ثقۃ جس سے یہ ثابت ہوگیا کہ یہ عجمی الاصل ملک رے کے رہنے والے تھے۔ ۱۲۰ھ میں وفات پائی۔ غرض صرف ابوعمرو الدانی نے بقول ابن حجران کو عبداللہ بن السائب المخزومی کا بھی شاگرد بتایا ہے۔ ابو عمرو الدانی متوفی ۴۴۴ھ کے سوا اور کوئی بھی متقدمین میں سے ان کو مجاہد کے سوا اور کسی دوسرے کا شاگرد قرآت میں نہیں بتاتا۔ بلکہ "تیسیر" میں ابوعمرو الدانی نے حضرت ابن عباس کے

ایک آزاد کردہ غلام مرداس کو بھی ان کا استاد قرآت بتایا ہے۔ لیکن "مرداس" نام کا کوئی شخص جو حضرت ابن عباس کا غلام آزاد کردہ ہو دنیائے رجال میں کہیں نظر نہیں آتا بالفرض اگر ہو اور کسی گوشہ گمنامی میں پڑا خراٹے لے رہا ہو تو وہ بھی ایک غلام آزاد کردہ ہی ٹھہرا۔ اور جو ایسا مجہول الحال ہو جس کا نام تک ائمہ رجال کی زبان پر نہیں آتا اس کا ذکر کیا؟

حقیقت یہ ہے کہ مجاہد سائب بن ابی السائب کے غلام آزاد کردہ تھے اس لئے مجاہد نے اپنے آقا سائب کے صاحبزادے عبداللہ سے قرآن پڑھ لیا ہو یہ ممکن ہے۔ سائب اور عبداللہ بن سائب دونوں باپ بیٹے صحابی تھے۔ عبداللہ بن السائب کی وفات ۶۵ ھ میں ہوئی تھی۔ حضرت عبداللہ بن عباس نے ان کے جنازے کی نماز پڑھائی تھی۔ عبداللہ بن کثیر عبداللہ بن سائب کی وفات کے وقت بہت کم سن تھے۔ اس لئے ابن کثیر کا ابن سائبؒ سے قرآن پڑھنا اور قرآت حاصل کرنا صحیح نہیں۔ ابن کثیر نے صرف اور صرف مجاہد بن جبیر سے قرآت کا فن حاصل کیا جیساکہ امام بخاری اور سارے ائمہ رجال لکھتے ہیں۔ ابو عمرو الدانی جو ابن کثیر سے دو سو برس سے زیادہ بعد کے آدمی ہیں ابن کثیر کے اساتذہ کے حال سے اتنا واقف نہیں ہوسکتے جتنا امام بخاری اور دوسرے ان سے متقدم ائمہ رجال واقف ہوسکتے ہیں۔

دانی اور ان کی کتاب "تیسیر" ابو عمرو الدانی کی تصنیف ہے ہی نہیں بلکہ یاران طریقت نے ایک کتاب تصنیف کرکے ان کے نام سے ان کی وفات کے بعد منسوب کرکے اس کی متعدد نقلیں کرکے پھیلائی ہیں جس

کا پتہ خود کتاب "تیسیر" کی ورق گردانی سے باآسانی مل سکتا ہے۔ بیسیوں جگہ آپ قال ابو عمرو اور قال ابو عمرو الدانی کے الفاظ دیکھیں گے اگر اس کتاب کے مصنف خود ابو عمرو الدانی ہوتے تو وہ خود اپنے متعلق قال ابو عمرو الدانی کیوں لکھتے؟ ہاں اگر دو شخصوں کے مکالمہ کا ذکر ہوتا اس طرح کہ "قال فلاں وقال عمرو" تو ممکن تھا کہ مصنف نے خود اپنا قول اپنے نام کی طرف منسوب کر کے لکھا ہو۔ مگر یہاں تو مکالمہ ومقادلہ کی صورت کہیں بھی نہیں۔ مسائل کتاب لکھنے میں قال ابو عمرو لکھنے کی کیا ضرورت تھی؟ اب یہ قال ابو عمرو اور قال ابو عمرو الدانی لکھنے والے کون صاحب ہیں جب تک ان کا صحیح نام ونشان نہ ملے اس وقت تک ان اقوال کی نسبت جو ابو عمرو الدانی کی طرف کی گئی اس کی صحت وعدم صحت کا فیصلہ کس طرح کیا جاسکتا ہے؟ مگر بہرحال ایسی کتاب قابل وثوق تو نہیں ہوسکتی یہی وجہ ہے کہ عبداللہ بن کثیر کے اساتذہ قرآت میں خلاف جمہور ائمہ رجال حضرت عبداللہ بن السائب رضی اللہ عنہ کا نام اس میں لکھ دیا گیا اور ایک مجہول نام "مرداس" حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے آزاد کردہ غلام کا نام بھی تعدد شیوخ ثابت کرنے کے لئے بڑھا دیا گیا ہے۔ بہرحال ابو عمرو الدانی بھی قرطبی تھے اور خاندان بنی امیہ کے آزاد کردہ غلام تھے۔ اتنا یاد رکھیئے کہ متقدمین ائمہ قرآت میں آپ تقریباً ۹۵ فیصدی موالی یعنی آزاد کردہ غلاموں ہی کو پائیں گے۔ اختلاف قرآت کا فتنہ ان غلاموں ہی کا پیدا کردہ تھا اور انہوں نے ایک زبردست سازش کے ماتحت یہ تحریک چلائی تھی۔

کتاب "تیسیر" اور اس کے مصنف ابو عمرو الدانی کا ذکر تو ضمناً آگیا۔

اب آپ عبداللہ بن کثیر کے اصل اور اکلوتے استاد مجاہد بن جبیر کا حال سنیئے کہ مکہ مکرمہ کے مرکزی اسکول کے ہیڈ ماسٹر یہی مجاہد بن جبیر ہی تھے عبداللہ بن کثیر تو ان کے ایک شاگرد تھے جن کے سر پر قرآت کی پگڑی باندھ دی گئی۔

مجاہد بن جبیر یہ سائب بن ابی سائبؓ کے غلام آزاد کردہ تھے ۔ ان کی پیدائش ۲۱ ھ میں زمانہ خلافت حضرت فاروق اعظمؓ ہوئی۔ ۸۳ برس کی عمر میں ۱۰۳ ھ میں وفات پائی ۔ تفسیر کے بڑے عالم سمجھے جاتے تھے کہتے تھے کہ حضرت ابن عباس کے سامنے تیس بار قرآن پڑھا۔ اعمش کوفی جو شیعہ بھی تھے اور ان کے شاگرد رشید بھی کہتے تھے کہ مجاہد کہتے تھے کہ " اگر ہم عبداللہ بن مسعود کی قرآت کے مطابق قرآن پڑھتے تو ہمیں اس کی حاجت نہ پڑتی کہ اکثر جگہ ابن عباس سے معنی مطلب پوچھ لیتے۔"
اگر اعمش کی یہ روایت صحیح ہے اور واقعی مجاہد نے ایسا کہا ہے تو تعجب اور سخت تعجب ہے کہ مجاہد نے اپنے کوفی اساتذہ و تلامذہ سے عبداللہ بن مسعود والا مصحف کیوں نہیں مانگ لیا تھا؟ ترمذی جلد دوم صفحہ ۱۳۸ مطبوعہ مجتبائی دہلی میں نقل مصاحف بعد حضرت ذوالنورینؓ والی روایت جو بخاری[۱] میں امام زہری سے ہی مروی ہے۔ یہاں بھی انہی

(۱) نقل مصاحف بعہد عثمانی کی روایت امام بخاری موسیٰ ابن اسماعیل سے وہ ابراہیم بن سعد سے، اور وہ زہری سے روایت کرتے ہیں اور ترمذی محمد بن بشار سے وہ عبدالرحمن بن مہدی سے وہ ابراہیم بن سعد سے اور وہ زہری سے روایت کرتے ہیں۔ مگر ابراہیم بن سعد موسیٰ بن اسماعیل سے وہ سب باتیں نہیں کہتے جو باتیں وہ عبدالرحمن بن مہدی سے کہتے ہیں۔ شاید اس لئے موسیٰ بن اسماعیل سے نہ کہا کہ وہ منقریوں کے غلام آزاد کردہ تھے۔ اور بعض لوگوں نے ان کے متعلق

زہری سے روایت کی گئی ہے مگر متعدد مضامین کے اضافے کے ساتھ جن سے بے چارے بخاری کو بے خبر ہی رکھنا مناسب سمجھا گیا تھا بہرحال ترمذی میں یہ موجود ہے کہ عبداللہ بن مسعودؓ نے اپنے عراقی تلامذہ کو منع کردیا تھا کہ آپ مصاحف کو مصحف عثمانی کے مطابق کرکے ضائع نہ کرو بلکہ اپنے حال پر باقی رکھو اور مصحف عثمانی کے طرف داروں سے اپنے مصحف کو چھپائے رکھو۔ محفوظ رکھو کہ کہیں وہ چھین کر ضائع نہ کریں۔ اس لئے عبداللہ بن مسعودؓ کے سینکڑوں تلامذہ جو عراق میں تھے سب کے پاس حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کا مصحف ضرور موجود ہوگا۔ کوفہ تو عراق

کچھ کلام بھی کیا ہے یا زہری نے ان سے بھی کہا ہو مگر ان کی ہمت نہ پڑی کہ امام بخاری سے یہ سب لغو باتیں کہہ دیں۔ بہرحال ترمذی کی روایت میں اصل روایت کے بعد تابوت اور تابوہ کا اختلاف بھی زید بن ثابت سے مروی ہے اور پھر عبداللہ بن مسعودؓ کی خفگی کا ذکر بھی ہے کہ انہوں نے اہل کوفہ کو پکار کر کہا کہ اے لوگو! ذرا انصاف کرو یہ چھوکرا (زید بن ثابت) کہ جب میں ایمان لایا تھا اس وقت یہ اپنے کافر باپ کی پیٹھ میں تھا۔ یہ تو جمع یا کتابت قرآن کے لیے بلایا جائے اور مجھ کو نظرانداز کردیا جائے۔ اس کے بعد ترمذی کی روایت کی عبارت ہے۔ **ولذالک قال عبدالله بن مسعود** اور اسی غصے کی وجہ سے کہ جمع ونقل مصاحف کے وقت ان کو نظرانداز کیوں کیا گیا۔ عبداللہ بن مسعودؓ نے پکار کر کہا کہ اے اہل عراق! **اکتموا المصاحف التی عندکم** تم اپنے مصاحف کو چھپائے رکھو **وغلوھا** اور اس کے ساتھ خیانت کرو۔ یعنی حضرت عثمانؓ جب اپنا مصحف بھیجیں کہ اپنے اپنے مصاحف کو اس کے مطابق بنالو اور جس مصحف میں اس سے اختلاف ہو اس کو دھو ڈالو یا جلا ڈالو تو تم لوگ اس حکم کو نہ ماننا۔ اپنے اپنے مصاحف کو ان کے اعمال سے چھپائے رکھو اور امیر المومنین کے حکم کی نافرمانی کرو اور اس طرح قرآن کے ساتھ خیانت کرو۔ اس کے بعد عبداللہ بن مسعودؓ نے فرمایا کہ قرآن میں ہے کہ جو شخص خیانت کرے گا تو جس چیز کی خیانت کی ہے اس کو لے کر قیامت کے دن بارگاہ الہی میں حاضر ہوگا۔ تم لوگ اپنے اپنے مصاحف کے ساتھ اللہ سے قیامت کے دن ملو۔ اس روایت سے یہ معلوم ہوگیا کہ کوفہ و عراق میں عبداللہ بن مسعودؓ کے تلامذہ کے پاس وہ سب قرآن عبداللہ بن مسعودؓ والا۔ ابی کعب والا اور جو کچھ بھی تھا سب موجود تھا۔ اور سب موجود رہا۔

کا مرکز فتنہ وفساد تھا اور اسی تلقین وتاکید ابن مسعودؓ کا حیلہ قائم کر کے تو کوفہ ہی سے اختلاف قرآت کا طوفان امڈا۔ مجاہد بن جبیر کے کوفی اساتذہ میں سے عبداللہ بن سخبرہ الازدی الکوفی۔ عبدالرحمن بن ابی لیلیٰ الکوفی، اور پھر خود عبداللہ بن مسعودؓ کے صاحبزادے ابو عبیدہ عامر بن عبداللہ بن مسعود الکوفی وغیرہم جن میں سے ہر ایک حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کا خاص شاگرد تھا سب سے نہیں تو ان کے صاحبزادے عامر سے تو ان کو عبداللہ بن مسعودؓ کا مصحف مل سکتا تھا۔ پھر ان کے خاص عقیدت کیش شاگردوں میں تو نوے فیصدی کوفی ہی تھے۔ عطا ابن السائب الکوفی، فطر بن خلیفۃ الکوفی، حکم بن عتیبہ الکوفی، زبید الیامی الکوفی، سلمہ بن کہیل الکوفی، سلیمان الاعمش الکوفی، منصور بن المعتمر الکوفی، مسلم بن عمران البطس الکوفی، حبیب بن ثابت مولیٰ بنی اسدالکوفی، حسن بن عمرو الفقیمی الکوفی، ابوجعفر عثمان بن مغیرۃ الکوفی اور عمرو بن ذرالکوفی وغیرہم۔ اتنے کوفیوں کے جھرمٹ میں رہنے والا مجاہد بن جبیر اور حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کے مصحف کے لئے ترستا رہے؟ ان میں سے تو ہر ایک کے پاس عبداللہ بن مسعودؓ کا مصحف موجود ہوگا۔ اگر یہ کسی سے بھی مانگتے تو متعدد نسخے اس مصحف کے ان کے پاس موجود ہوجاتے۔ مانگنے کی بھی ضرورت نہ تھی۔ صرف جو اعمش سے کہا تھا وہی کسی اور کوفی سے کہتے تو ان کو گوہر مقصود مل جاتا۔ اعمش چونکہ شیعہ تھے اس لئے انہوں نے ایک سنی سے اغماض کیا ورنہ ان کے پاس بھی ضرور ہوگا۔

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نہ ترمذی کی وہ روایت صحیح ہے کہ صرف اس غصے پر کہ ان کو جمع قرآن یا نقل مصاحف کے وقت کیوں نہ پوچھا

گیا۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے امیرالمومنین کے حکم ہی کو نہیں بلکہ سارے صحابہؓ کے خلاف اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد ضرار الگ بناکر قرآن مجید میں اختلافات کو قائم رکھنے اور لوگوں کو گمراہ کرنے کا سامان مہیا کردیا۔ اور اس غصے میں اپنے ساتھ اپنے شاگردوں کو بھی گمراہ کیا؟ نعوذ باللہ من ذالک حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی شان اس قسم کی کینہ پروری اور بغض وعناد سے بہت پاک و بالاتر تھی۔ یہ ساری باتیں ان پر بہتان ہیں۔ بلکہ جمع قرآن بعہد صدیقیؓ ونقل مصاحف بعہد عثمانیؓ کی روایتیں ہی سرے سے موضوع اور منافقین کی سازشوں کے ماتحت گھڑی گئیں اور صحیح بخاری وترمذی ونسائی ومسند احمد وغیرہ میں داخل کردی گئیں۔ خود امام بخاری وامام ابوعیسیٰ الترمذی و امام نسائی وامام احمد بن حنبل کا دامن تقدس ان روایتوں کی آلودگیوں سے جہاں تک میں سمجھتا ہوں یقیناً پاک ہے۔ اور عجب کیا ہے کہ مجاہد نے بھی ایسا نہ کہا ہو۔ یہ سلیمان الاعمش شیعہ کوفی نے غریب مجاہد پر بہتان باندھا ہو۔ واللہ اعلم بالصواب بہرحال اتنی تصریح سے یہ فائدہ ہوا کہ اہل مکہ کے لئے جو قرآت کا اسکول بنایا گیا تھا اور اس کا ہیڈ ماسٹر مجاہد بن جبیر کو بنایا گیا تھا اس کا پتہ مل گیا کہ وہ کوفیوں کا ہی ساختہ پر داختہ تھا۔ مجاہد کے اصل استاد جو طریق کار سکھاتے تھے وہ بھی کوفی ہی تھے اور ان کے شاگردان رشید بھی تقریباً سب کے سب کوفی ہی تھے۔ مجاہد مکے میں رہتے تھے مگر ان سے قرآت کا فن کوفیوں کی جماعت سیکھتی تھی۔ اہل مکہ میں جو لوگ صحابہ کرامؓ کی اولاد میں تھے یا اکابر تابعین تھے ان کو کون سی ایسی ضرورت پڑی تھی کہ ایک غلام آزاد کردہ سے وہ قرآت سیکھتے۔ اسی

لئے آپ اہل مکہ میں ان کے تلامذہ ڈھونڈھیں گے تو ان میں بھی زیادہ تر موالی (آزاد کردہ غلام) یا کچھ دیہاتی عوام ہی کو پائیں گے۔ جیسے ابوالزبیر محمد بن مسلم المکی جو بنی اسد کے آزاد کردہ غلام تھے اور کوفے میں بنی اسد کا ایک مستقل محلہ تھا جن میں اکثریت شیعوں ہی کی تھی اور یہی محلہ وہاں سازش گاہ تھا۔ اور عبیداللہ بن ابی یزید المکی جو آل قارض بن شیبہ کے آزاد کردہ غلام تھے اور سیف بن سلیمان جو مخزومیوں کے آزاد کردہ غلام تھے اور عبداللہ بن کثیر الداری القاری جو مجاہد کے خاص شاگرد اور قرآتی اسکول کے اسسٹنٹ ہیڈ ماسٹر مکے میں مجاہدؒ کے ساتھ بنے اور مجاہد کے بعد قرآت کی پگڑی انہیں کے سر پر باندھ کر مکی اسکول کا مستقل ہیڈ ماسٹر انہیں کو بنادیا گیا۔ یہ بھی عمرو بن عقلمۃ الکنانی کے آزاد کردہ غلام تھے۔ اس تفصیل سے آپ عبداللہ بن کثیر قاری مکہ سے تو پوری طرح واقف ہوگئے۔ اب ان شاگردان رشید کا حال بھی سن لیجئے۔

قنبل ان کے تلامذہ حدیث میں تو متعدد ہیں جن میں بعض ثقہ بھی ہیں مگر قرآت میں ان کے دو شاگرد قرآت والوں کے نزدیک مشہور ہیں جن میں سے ایک قنبل ہیں۔ ان کا پورا نام ونسب یہ ہے۔ محمد بن عبدالرحمن بن محمد بن خالد بن سعید بن خرجۃ المخزومی المکی۔ یہ

---

(۱) مودودی صاحب نے عبداللہ بن کثیر کو صرف حضرت عبداللہ بن السائب رضی اللہ عنہ کا شاگرد لکھ کر بڑی خیانت کی ہے۔ مجاہد بن جبیر جو ابن کثیر کے متفق علیہ اور مشہور استاد تھے ان کا ذکر تک نہ کیا اور ابو عمرو الدانی نے جو بلا دلیل خلاف جمہور اور خلاف قیاس بات لکھ دی۔ اسی کو لکھ دیا۔ کیا علمی تحقیق اسی کا نام ہے؟ کہ غلط کمزور خلاف قیاس ایک شخص ۱۰ ۵ بلا دلیل قول تو نقل کیا جائے اور جمہور ائمہ رجال کا متفق علیہ قول ترک کردیا جا ؟

مخزومیوں میں سے کسی کے آزاد کردہ غلام تھے۔ " قنبل " ان کا لقب تھا۔ ۱۹۵ھ میں پیدا ہوئے۔ قرآت کا فن ابوالحسن القواس وغیرہ سے سیکھا۔ مگر عبداللہ بن کثیر سے ان کا قرآن مجید پڑھنا یا قرآت کا فن حاصل کرنا ائمہ رجال نہیں لکھتے۔ " تیسیر " میں ابو عمرو الدانی ان کا سال وفات ۲۸۰ھ لکھتے ہیں۔ ۲۹۱ھ ابن حجر نے لسان المیزان میں لکھا ہے اور یہ بھی لکھا ہے کہ یہ اپنی وفات سے سات برس پہلے کچھ مختل الحواس ہوگئے تھے۔ اس زمانہ اختلال میں ان سے لوگ قرآن مجید نہیں پڑھتے تھے۔ بہرحال ان کو ائمہ رجال عبداللہ بن کثیر کا شاگرد نہیں لکھتے ہیں۔ ان کے ترجمہ میں بھی ابن حجر لکھتے ہیں کہ انہوں نے قرآت کا فن احمد بن محمد بن عون القواس (کمان ساز) النبال ابوالحسن المقری سے حاصل کیا تھا اور قواس کے ترجمے میں بھی لکھتے ہیں کہ ان سے قنبل نے قرآت حاصل کی تھی مگر قواس صاحب ممدوح نے قرآت کا فن ایک گمنام مجہول الحال شخص ابو الاخریط وہب بن واضح سے حاصل کیا تھا۔ یہ نہ معلوم ہوسکا کہ ان ابوالاخریط صاحب نے کس سے قرآت کا فن سیکھا تھا نہ یہ پتہ ملتا ہے کہ یہ کس قبیلے کے رہنے والے تھے۔ لیکن ائمہ قرآت نے یہ التزام کیا ہے کہ ہر قاری کے دو شاگرد کسی نہ کسی طرح ضرور پیش کردیئے جائیں۔ کیونکہ دو سے زیادہ قرآت کے شاگرد کسی کے بھی مہیا ہوی نہیں سکتے تھے۔ عبداللہ بن کثیر کے دو شاگرد مل نہیں رہے تھے۔ صرف ایک شاگرد رشید ان کے تھے وہ بھی بالواسطہ جن کا نام نامی ابھی آپ کے سامنے آتا ہے۔ اس لئے زبردستی قنبل غریب کو جسؔ نے کبھی ایک آیت بھی غالباً عبداللہ بن کثیر کو نہیں سنائی ہوگی بلکہ ایک دوسرے کے شاگرد تھے۔ اپنی کتابوں میں

ان کو عبداللہ بن کثیر کا شاگرد لکھ دیا، لیکن یہ بھی مخزومیوں کے غلام آزاد کردہ ہی تھے اور مکے ہی میں رہتے تھے۔

بزی یعنی احمد بن محمد بن عبداللہ بن القسم بن البزہ بن نافع بن ابی بزہ۔ جو مکہ معظمہ میں موذن تھے۔ یہ بھی مخزومیوں کے آزاد کردہ غلام تھے ان کا مفصل ترجمہ ابن حجر نے لسان المیزان جلد ا، صفحہ ۲۸۴ میں لکھا ہے۔ یہ منکرالحدیث، غیر ثقہ من گھڑت حدیثیں روایت کرنے والے تھے۔ جس کا یہ برتاؤ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہو کہ جھوٹی باتیں آپ کی طرف منسوب کرے وہ قرآن مجید کا احترام کہاں تک باقی رکھے گا۔ ہر صاحب عقل سلیم سمجھ سکتا ہے۔ انہیں من گھڑت حدیثوں میں سے ایک یہ بھی ہے کہ یہ روایت کرتے ہیں کہ میں نے عکرمہ بن سلیمان سے سنا کہ وہ کہتے تھے کہ میں نے اسماعیل بن عبداللہ بن قسطنطین کے سامنے قرآن مجید پڑھا تو جب والضحیٰ پر میں پہنچا تو انہوں نے کہا کہ اللہ اکبر کہو یہاں سے ہر سورہ کے خاتمہ پر۔ میں نے بھی عبداللہ بن کثیر کے سامنے قرآن پڑھا تھا تو انہوں نے مجھ سے کہا تھا جب میں والضحیٰ پر پہنچا کہ تکبیر کہو یہاں سے ہر سورہ کے خاتمہ پر۔ اور عبداللہ بن کثیر نے ان کو خبر دی کہ انہوں نے مجاہد بن جبیر کے سامنے جب قرآن مجید پڑھا تھا تو اسی بات کا انہوں نے ان کو حکم دیا تھا اور خبر دی تھی کہ جب انہوں نے یعنی مجاہد نے ابن عباسؓ کے سامنے قرآن پڑھا تھا تو انہوں نے بھی مجاہد سے یہی کہا تھا اور حضرت ابن عباسؓ نے مجاہد سے کہا کہ مجھ کو ابی ابن کعبؓ نے اس کی خبر دی تھی اور ابی ابن کعبؓ نے ابن عباس سے کہا کہ مجھ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا حکم

فرمایا تھا۔

ابن حجر لکھتے ہیں کہ یہ حدیث غریب اور محدثین نے "بزی" کی اس حدیث سے انکار کیا ہے۔ ابو حاتم نے اس حدیث کو منکر قرار دیا ہے۔ غرض یہ حدیث محدثین اور نقادان حدیث کے نزدیک محض موضوع اور بزی صاحب کی من گھڑت ہے۔ ان کے سوا کوئی بھی اس کی روایت نہیں کرتا۔ مگر قرآت والوں کے ہاں یہ حدیث معتبر سمجھی جاتی ہے اور اس کو مسنون بلکہ بعضے سنت موکدہ قرار دے کر اس کی پابندی کرتے ہیں خصوصاً جو لوگ عبداللہ بن کثیر کے اسناد کے پابند ہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ سنت نہیں بلکہ بدعت ہے اور اس کی پابندی یا اس کی حمایت کذب علی الرسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حمایت اور سراسر گناہ اور گمراہی ہے لیکن اس روایت سے یہ بات تو ضرور ثابت ہوگئی کہ یہ بزی صاحب بھی عبداللہ بن کثیر کے بلاواسطہ شاگرد نہ تھے بلکہ یہ شاگرد تھے اسماعیل بن عبداللہ بن قسطنطین کے اور وہ شاگرد تھے عبداللہ بن کثیر کے۔ مگر یہ اسماعیل بن عبداللہ بن قسطنطین کون ہیں اس کا پتہ نہیں مل سکا۔ ابن حجر امام ذہبی، کسی نے ان کا کچھ بھی ذکر کسی کتاب میں نہیں کیا ہے۔ یہ ابن قسطنطین بھی ابوالاخریط قنبل کے استاد الاستاد کی طرح بالکل مجہول الحال ہیں۔ اسی لئے یاران طریقت نے قنبل و بزی دونوں کو بلاواسطہ عبداللہ بن کثیر کا شاگرد لکھ دیا کہ جو دیکھے گا صحیح ہی سمجھ لے گا۔ کسی کو کیا پڑی ہے کہ خواہ مخواہ کرید کرے گا مگر کسی کو کیا خبر تھی کہ ایک ہزار برس کے بعد اللہ تعالیٰ اپنے ایک بندے تمنا عمادی کو اس کی توفیق دیگا کہ وہ اس فتنہ موالی کا پردہ چاک کر کے آفتاب قرآن کے

چہرہ تاباں سے غبار اختلافات دور کردے۔ وقد قال اللہ عزوجل ان الذین یلحدون فی ایاتنا لا یخفون علینا۔ (۴۱ : ۴۰)

تو یہ معلوم ہوگیا کہ عبداللہ بن کثیر بھی آزاد کردہ غلام تھے۔ ان کے استاد مجاہد بھی مخزومیوں کے غلام تھے اور ان کے دونوں شاگرد بھی مخزومیوں کے غلام تھے۔ مکہ ومدینہ زادہما اللہ شرفاً دونوں کے عزوشرف کے باوجود دونوں کی قسمت دیکھئے کہ ان دونوں کو امام القرآت ملے تو موالی (آزاد کردہ غلام) ہی ملے۔ اولاد صحابہ واکابر تابعین میں سے کوئی شخص ایسا نہ تھا جو حرمین شرفین کی امامت قرآت کے منصب کا اہل ہوتا۔ عجمی الاصل یا افاقی غیر قریشی مکہ مدینہ میں رہ کر ہزار قریشی لب ولہجہ سیکھیں مگر خود قریشیوں کا جو فطری وجبلی لب ولہجہ تھا وہ ان کو کہاں میسر آسکتا تھا۔ پھر جو لوگ بچپن سے بیسیوں بلکہ سینکڑوں صحابہ کو قرآن پڑھتے ہوئے سنتے آئے تھے اور خود پڑھتے رہے یہ موالی کبھی ان کو پاسکتے تھے؟ حاشا وکلا کبھی نہیں۔ مگر یہاں تو موالیوں ہی کی سازش کے ماتحت اختلافات قرآت کی تحریک چلائی گئی تھی اس میں اولاد صحابہ واکابر تابعین کو کس طرح شریک کیا جاسکتا۔ مدینے میں نافع اور مکہ میں مجاہد کوفیوں کے دو ایجنٹ بٹھا دیئے گئے تھے کہ چپ چاپ اپنے پر تکلف زہد وورع کے ذریعے ان جگہوں کے اکابر واصاغر کے دلوں میں اپنا رسوخ قائم کئے رہیں۔ اکابر سے حدیثیں سنیں اور اصاغر سے صرف حدیثیں بیان کریں۔ قرآن مجید نہ لوگوں سے پڑھیں، نہ ان میں سے کسی کو پڑھائیں۔ قرآن مجید کی تعلیم وتعلم اپنے حلقے سے باہر نہ ہو، کیونکہ جو اختلافات پھیلانا ہیں اگر اُن کی رازداری آغاز میں نہ کی گئی اور اکابر تابعین و اولاد

صحابہؓ پر سازش کا راز کہیں کھل گیا تو پھر یہ سازش اور اس کے ماتحت اختلاف قرآت کی تحریک ہمیشہ کے لئے ختم ہو جائے گی۔

حرمین شریفین کے دونوں اسکول قرآت اور ان کے ہیڈ ماسٹر اور اسٹوڈنٹوں کا حال تو آپ کو پوری طرح معلوم ہوگیا۔ اب دوسرے مقامات کے اسکولوں کا بھی معائنہ کرلیجئے۔

(۳) ابو عمرو بن العلا البصری التمیمی

ولادت ۶۸ھ وفات ۱۵۴ھ عمر ۸۶ سال

مودودی صاحب نے سال وفات ۱۵۵ھ لکھا ہے جو صحیح نہیں ہے اور بعضوں نے ۱۵۷ھ لکھ دیا ہے وہ بھی غلط ہے۔ بہرحال یہ ابو عمرو بن العلاء بن عمادا لتمیمی بصرے کے رہنے والے تھے۔ ائمہ رجال ان کی توثیق کرتے ہیں۔ حسب تصریح ابن حجر (تہذیب التہذیب جلد ۱۲، صفحہ ۱۷۸) انہوں نے حمید بن قیس الاعرج یحییٰ بن یعمر، مجاہد بن جبیر، سعید بن جبیر، عکرمۃ البربری اور عبداللہ بن کثیر سے قرآن پڑھا تھا اور ان سے عبدالوارث بن سعید، حماد بن زید، معاذ بن معاذ، ہارون الاعور، یونس بن حبیب النحوی، یحییٰ بن المبارک الیزیدی، ابوبحر البکراری، خارجہ بن مصعب اور عبدالوہاب بن عطا وغیرہم نے قرآن پڑھا تھا۔ تو اب پہلے ان کے شیوخ سے تعارف حاصل کرلیجئے اس کے بعد ان کے تلامذہ سے بھی مصافحہ کرلیجئے گا۔

حمید بن قیس الاعرج ابو صفوان المکی الاسدی۔ یہ اسدیوں میں سے کسی کے آزاد کردہ غلام تھے۔ مجاہد سے حدیث روایت کرتے ہیں۔ مگر ان

سے قرآن پڑھنے کا ذکر نہیں ہے بلکہ کوئی بھی یہ نہیں بتاتا کہ انہوں نے فن قرآت کس سے سیکھا۔ ان کے ترجمہ میں ان کو قاری و مقری بھی نہیں لکھا ہے ۔ یہ بھی مذکور نہیں کہ ان سے ابو عمرو بن العلاء نے قرآن پڑھا تھا۔ ابوبکر عمرو بن العلاء سے ۲۴ برس پہلے ۱۳۰ھ میں وفات پائی ۔

یحییٰ بن یعمر المروزی البصری۔ مرو کے رہنے والے تھے۔ بصرے میں آلبسے تھے۔ پھر مرو میں قاضی بھی مقرر ہوئے تھے۔ شراب منصّف پیتے تھے۔ اس لئے معزول کردیئے گئے تھے۔ بڑے ادیب ماہر عربیت عالم لغت اور مشہور نحوی تھے۔ حسین بن الولید، ہارون بن موسیٰ سے روایت کرتے ہیں کہ قرآن مجید پر سب سے پہلے نقطے انہوں نے لگائے ۔ نحو میں ابوالاسود الدؤلی کے شاگرد تھے۔ ان کے سال وفات میں اختلاف ہے کسی نے ۱۲۹ھ کسی نے ۱۲۱ھ کے لگ بھگ لکھا ہے مگر صحیح قول یہ ہے کہ ان کی وفات ۸۹ھ میں عمرو بن العلا سے ۶۵ سال پہلے ہوئی تھی اس لئے ان سے عمرو بن العلاء کا پڑھنا ذرا مشتبہ ہے۔ خلاصۃ التہذیب صفحہ ۴۲۹

---

(۱) قرآن مجید پر نقطے لگانا اور بات ہے اور عربی رسم الخط میں نقطوں کا ایجاد کرنا اور بات ہے۔ اصل یہ ہے کہ کوفے والوں نے حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی وفات کے بعد بے نقطوں کے قرآن لکھنا شروع کیا اور مشہور کیا کہ عبداللہ بن مسعودؓ نے فرمایا تھا کہ قرآن میں نقطے نہ دیا کرو۔ جس کی وجہ سے کوفہ بصرہ وغیرہ میں غیر منقوط قرآن مروج ہوگیا ۔ لوگوں کو اس کا موقع مل گیا کہ یعلمون کو تعلمون پڑھیں۔ اس خرابی کو محسوس کرکے بصرے والوں میں سب سے پہلے یحییٰ بن یعمر نے اپنے مصحف پر نقطے لگائے پھر ان کے سمجھانے سے دوسروں نے بھی ایسا ہی کیا۔ یہ سمجھنا کہ یحییٰ بن یعمر بھی عربی رسم خط میں حروف پر نقطے لگانے کے موجد تھے غلط ہے۔ جس کی مفصل بحث میں اس مضمون کے آغاز میں کرچکا ہوں اور دلائل قطعیہ سے ثابت کرچکا ہوں کہ عربی رسم خط کے حروف جس نے وضع کئے تھے یہ ناممکن ہے کہ اس نے پہلے صرف حروف وضع کئے ہوں اور نقطے بعد والوں نے ایجاد کرکے لگائے ہوں۔

میں لکھا ہے کہ ۹۰ھ سے پہلے خراسان میں وفات پائی۔ اس لئے ۸۹ھ ہی میں وفات کی روایت صحیح ہے۔

مجاہد بن جبیر سے تو آپ پوری طرح واقف ہوچکے ہیں کہ وہ مخزومیوں کے آزاد کردہ غلام تھے اور کوفیوں کے ایجنٹ بن کر مکے میں اختلاف قرآت کی کھچڑی چپکے چپکے پکارہے تھے۔ ان کے بعض حالات میں نے وہاں نہیں لکھے تھے وہ کمی یہاں پوری کردوں۔ تو بہتر ہے سنئے۔ ان کی تفسیر بہت مشہور ہے مگر ابن حجر تہذیب التہذیب جلد ۸، صفحہ ۳۱۰ میں لکھتے ہیں کہ "مجاہد سے ان کی تفسیر قاسم بن ابی بزہ کے سوا اور کسی نے نہیں سنی تھی۔ جس نے بھی مجاہد کی تفسیر پائی ہے وہ قاسم بن ابی بزہ کی کتاب سے۔" اس لئے بروایت احاد ہی ان کی تفسیر دوسروں کو ملی ہے۔ اور جلد ۱۰، صفحہ ۴۳ ترجمہ مجاہد میں لکھتے ہیں کہ "ابوبکر بن عیاش نے اعمش سے پوچھا کہ لوگ مجاہد کی تفسیر سے پرہیز کیوں کرتے ہیں؟ تو اعمش نے جواب دیا کہ لوگ سمجھتے ہیں کہ انہوں نے اہل کتاب سے پوچھ پوچھ کے تفسیر لکھی ہے۔ مجاہد نے ایک موقع پر کہا تھا کہ خرج علینا علی یعنی حضرت علیؓ ہم لوگوں کے سامنے آئے۔" یحییٰ بن معین مشہور محدث فرماتے ہیں کہ یہ کچھ بھی نہیں ہے بے اصل بات ہے مجاہد کی روایتیں حضرت علی سے مرسل ہیں۔ مجاہد حضرت سعد، حضرت معاویہ، حضرت کعب بن عجرہ، حضرت ابوہریرہ، اور حضرت عبداللہ بن عمر سے بھی جو روایت کرتے ہیں وہ مرسل ہیں۔ اسی طرح ابو سعید خدری اور رافع بن خدیج سے بھی بلا واسطہ ان کی روایتیں صحیح نہیں اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ یہ پیشاب کرکے پاکی نہیں لیتے تھے۔ ترمذی نے یہ

بھی لکھا ہے کہ ان کا مدلس ہونا معلوم ہے اس لئے اگر عن فلاں عن فلاں کرکے بھی کسی حدیث کی روایت کریں تو ان کے سلسلہ اسناد کا نفس الواقع متصل ہونا کوئی ضروری نہیں ہے یعنی ممکن ہے کہ تدلیس سے کام لیا ہو۔ اب وہاں کی اور یہاں کی سب باتیں ملاکر مجاہد کے حالات پر غور فرمالیجئے۔

سعید بن جبیر بن ہشام الاسدی جو اسدیوں کے آزاد کردہ غلام تھے، کوفی تھے۔ ابن الاشعث کے ساتھ خلیفہ وقت عبدالملک بن مروان کے خلاف باغیانہ خروج کیا تھا۔ ابن الاشعث کو جب شکست ہوئی تو یہ بھاگ نکلے اور ادھر ادھر چھپتے پھرے آخر ایک مدت کے بعد مکہ معظمہ میں گرفتار ہوگئے۔ حجاج بن یوسف والئی عراق کے پاس لائے گئے۔ حجاج نے پہلے وہ احسانات جتائے جو ان کے ساتھ کئے تھے۔ انہوں نے قبول کیا کہ بے شک مجھ پر احسانات ہیں تو خروج کی وجہ پوچھی۔ انہوں نے کہا کہ ہم بیعت کرچکے تھے اس لئے مجبور ہوگئے۔ حجاج نے کہا کہ امیرالمومنین کی بیعت کا حق پورا کرنا مقدم تھا یا باغی کی بیعت کا حق پورا کرنا؟ ان کے پاس کچھ جواب نہ تھا۔ آخر ۹۵ ھ میں (۴۹) برس کی عمر میں مارے گئے۔ مگر بڑے محدث اور ثقہ سمجھے جاتے ہیں مگر تھے یہ بھی بنی اسد کے آزاد کردہ غلام اور کوفی تھے۔ یہ بھی ایک بات سمجھنے کی ہے کہ جن جن لوگوں کو بغاوت یافتہ وفساد کے سبب سے حجاج نے قتل کیا تھا ان لوگوں کو اہل کوفہ نے بہت بڑھایا ہے کہ ایسے تھے اور ویسے تھے۔ پھر بھی ان کے علم وفضل کا کچھ لحاظ نہ کیا اور حجاج نے انہیں قتل کردیا۔ اور پھر باہر والوں نے بھی اہل کوفہ کی ہاں میں ہاں ملائی۔ حقیقت یہ ہے کہ الفتنة اشد

من القتل عراق فتنہ پردازوں سے بھرا ہوا تھا اور کوفہ ان کا اصل مرکز تھا یہ موقع اس کا نہیں کہ ہم کوفہ و عراق کی سازشوں اور وہاں کے فتنوں پر بحث کریں۔ انشاء اللہ کبھی موقع ملا تو اس پر مستقل طور سے قلم اٹھاؤں گا۔ اس وقت تو ہمیں فقط یہ دکھانا ہے کہ اختلافات قرآت کی تحریک سازش کا نتیجہ تھی اور عجمی الاصل غلاموں ہی نے یہ تحریک اٹھائی اور انہیں کے ہاتھوں پروان چڑھی۔ اور کوفہ میں اس تحریک کا خاص مرکز تھا۔ سعید بن جبیر چاہے محدثین کے نزدیک کتنے ہی بڑے محدث اور ثقہ ہوں مگر تھے عجمی الاصل ایک آزاد کردہ غلام، اور پھر کوفی تھے۔ مگر ان کے ترجمے میں اس کا ذکر نہیں ہے کہ یہ قاری یا مقری تھے۔ مگر اصطلاحی قاری نہ سہی لغوی حیثیت سے ہر محدث کو قاری و مقری ہونا چاہیئے اور عام اصطلاح کے اعتبار سے تو قاری حافظ قرآن کو کہتے تھے۔ اور ہر محدث حافظ قرآن ضرور ہوتا تھا جس کو قرآن یاد نہ ہو وہ حدیث کیا یاد کرے گا۔ مگر کسی نے یہ بھی نہیں لکھا کہ ابو عمرو بن العلاء نے یا کسی اور نے ان سے قرآن پڑھا تھا یا قرآت کا فن سیکھا تھا اور نہ قرین قیاس ہے کہ ابوعمرو بن العلاء کو ان سے قرآن پڑھنے کا وقت ملا ہو کیونکہ عبدالرحمن بن الاشعث نے ۱۴ جمادی الاخری ۸۳ھ کو شکست کھائی تھی۔ ۸۳ھ سے یہ برابر روپوش رہے اور ۹۵ھ میں آخر مارے گئے۔ ابو عمرو بن العلاء کی پیدائش ۶۸ھ کی ہے ابن الاشعث کی شکست کے وقت ابو عمرو پندرہ برس کے تھے۔ بلکہ حجاج بن یوسف نے سیستان کی مہم پر عبداللہ بن ابی بکرہ کی مدد کے لئے ۷۲ھ میں بیس ہزار بصریوں کی فوج اور بیس ہزار کوفیوں کی فوج لے کر عبدالرحمن بن الاشعث کو سیستان کی طرف

بھیجا تھا۔ کوفیوں کی اسی فوج میں سعید بن جبیر بھی تھے اس مہم سے واپسی کے قبل ہی اسی سال عراقیوں نے ابن الاشعث کی سرکردگی میں خلافت سے بغاوت کی اور عبدالرحمن بن الاشعث کو خلیفہ تسلیم کرکے ابن الاشعث کے ہاتھ پر بیعت کی۔ اس بیعت میں سعید بن جبیر بھی شریک تھے۔ اسی بیعت کا ذکر سعید بن جبیر نے اپنے قتل کے دن حجاج کے سامنے کیا تھا۔ غرض سعید بن جبیر ۷۲ھ سے پہلے بڑے محدث ہوں گے مجھ کو اس سے انکار نہیں مگر وہ ۷۲ھ سے سرگرم سیاست اور مرد میدان بغاوت رہے۔ ۷۲ھ میں ابو عمرو بن العلاء چار برس کے تھے۔ اور ۷۲ھ سے ۹۵ھ تک یعنی آغاز جہاد پھر ابتدائے بغاوت، پھر شکست، پھر روپوشی، پھر قتل تک ۲۳ برس کی مدت میں کچھ حدیثوں کی روایت کا موقع مل سکتا تھا۔ مگر اس کا موقع ملنا ممکن نہ تھا کہ وہ کسی کو پورا قرآن فن قرآت کے ماتحت ایک جگہ بیٹھ کر پڑھاتے۔ اس لئے سعید بن جبیر سے ابو عمرو بن العلاء کا قرآن پڑھنا اور فن قرآت سیکھنا بالکل ناممکن ہے عکرمۃ البربری یہ عبداللہ بن عباسؓ کے آزاد کردہ غلام تھے اور مشہور محدث ومفسر تھے۔ حضرت ابن عباسؓ کے شاگرد تھے۔ مگر یحییٰ بن سعیدالانصاری عکرمہ کو کذاب کہتے تھے۔ اور حضرت عبداللہ بن عمرؓ اپنے غلام نافع سے کہتے تھے کہ جس طرح عکرمہ جھوٹی باتیں ابن عباس کی طرف منسوب کیا کرتا ہے اسی طرح تم بھی مجھ پر جھوٹی باتیں نہ لگایا کرو۔ امام مالک عکرمہ کو سخت ناپسند کرتے تھے۔ آخر میں خوارج کا مسلک عکرمہ نے اختیار کرلیا تھا پہلے ریاضیہ بنے جو خوارج کا کسی قدر معتدل فرقہ تھا۔ اس کے بعد صفریہ بنے جو غالی ومتعصب فرقہ تھا۔ ایک بار کچھ

لوگوں میں عکرمہ نے کہا کہ - ایک دن ابن عباس نے قرآن مجید کی یہ آیت پڑھی لم تعظون قوما الله مهلكم او معذبهم عذاباً شديدا۔ (۷:۱۶۴)
اور فرمایا کہ میں نہیں جانتا کہ وہ قوم ہلاک ہوگئی یا اس کو نجات بخشی گئی (عکرمہ کہتے ہیں کہ) میں ان کو سمجھاتا رہا یہاں تک کہ وہ سمجھ گئے کہ اس قوم نے نجات پائی۔ تو ابن عباس نے (خوش ہوکر) مجھ کو پوشاک پہنائی۔" (تہذیب التہذیب جلد ۷، صفحہ ۲۶۵) یہ سراسر افتراء اور بہتان ہے حضرت ابن عباسؓ پر اور اس روایت سے حضرت شعبہ کے اس قول کی تصدیق بھی ہوتی ہے جو انہوں نے سفیان ثوری سے کہا تھا کہ کلما تقدمتم فی الحدیث تاخرتم عن القرآن جہاں تک تم حدیث میں آگے بڑھوگے وہاں تک قرآن سے پیچھے ہٹتے جاؤگے۔ یعنی جن لوگوں کے سامنے عکرمہ نے یہ کہا تھا ان میں سے کسی کو بھی قرآن مجید یا کم سے کم سورہ اعراف کا اکیسواں رکوع یاد نہ تھا کہ وہ عکرمہ کو جھٹلاتا۔ اور نہ راوی کو یہ توفیق ہوئی کہ عکرمہ سے حکایت نقل کرنے سے پہلے قرآن مجید میں یہ آیت دیکھ لیتا۔ یہاں تک کہ حافظ ابن حجر نے بھی اپنی کتاب میں یہ روایت نقل کرنے کے وقت قرآن مجید کی اس پوری آیت پر غور کرنے کی ضرورت محسوس نہیں فرمائی۔ سورہ اعراف کا اکیسواں رکوع اسکی ایک سو تریسٹھویں آیت سے شروع ہوتا ہے اور ایک سو چھیاسٹھویں آیت پر بنی اسرائیل کی تین جماعتوں کے حالات ختم ہوجاتے ہیں۔ وہ چار آیتیں معہ ترجمہ حسب ذیل ہیں:

وسئلهم عن القرية التى كانت حاضرة البحر اذ يعدون
فى السبت اذ تاتيهم حيتانهم يوم سبتهم شرعا ويوم

لایسبتو ن لا تاتیھم کذالک نبلو ھم بما کانو ا یفسقو ن
O قالت امۃ منھم لم تعظلو ن قو ما اللہ مھلکھم
او معذبھم عذاباً شدیدا قالو ا معذرۃ الی ربکم و لعلھم
یتقو ن O فلما نسو ا ماذکرو ا بہ انجینا الذین ینھو ن
عن السو ء و اخذنا الذین ظلمو ا بعذاب بئیس بما کانو ا
یفسقو ن O فلما عتو عن مانھو ا عنہ قلنا لھم کو نو ا
قردۃ خاسئین O

اور تم بنی اسرائیل سے اس بستی کا حال پوچھ لو جو سمندر کے کنارے آباد تھی۔ جب سینچر (کے دن مچھلیوں کے شکار سے ممانعت کے بارے) میں زیادتیاں کررہے تھے کہ جب ان کے سینچر کے دن مچھلیاں ان کے سامنے تیرتی جمع ہوجاتی تھیں اور جب سینچر کا دن نہیں ہوتا تو مچھلیاں نہیں آتیں۔ ہم ان کو ان کی بدکرداری کی وجہ سے اس طرح آزماتے رہے۔ اور جب ان میں سے ایک جماعت نے (ان کی دوسری جماعت کو) کہا کہ تم لوگ ایسے لوگوں کو کیوں نصیحت کرتے ہو جن کو اللہ ہلاک کرنے والا ہے۔ یا کسی سخت عذاب میں مبتلا کردینے والا ہے تو ان نصیحت کرنے والوں نے کہا کہ ان کے رب کے آگے عذر کرنے کے لئے اور شاید یہ لوگ اللہ سے ڈریں۔ تو جب وہ نصیحتیں جو ان کو کی گئی تھیں وہ لوگ بھول گئے تو جو لوگ انہیں برائی سے روکتے تھے ہم نے ان کو بچالیا۔ اور ظالموں کو

ہم نے ان کی بدکرداری کے سبب سے ایک خوفناک عذاب
میں مبتلا کردیا۔ تو جب سرکشی کی انہوں نے اور نہ مانی وہ بات
جس سے منع کئے گئے تھے تو ہم نے کہا کہ ہو جاؤ ذلیل ورسوا
بندر۔

حضرت داؤد کے زمانے میں بنی اسرائیل تین جماعتوں میں بٹ گئے تھے۔ ایک جماعت سرکش اور نافرمان تھی اور دو جماعتیں مومنین کی تھیں۔ مگر مومنین کی دو جماعتوں میں سے ایک جماعت نے سرکشوں سے ترک موالات کرکے بالکل علیحدگی اختیار کرلی تھی اور ایک جماعت ان سرکشوں کے ساتھ رہتی تو تھی لیکن ان کو وعظ و نصیحت کرتی رہتی تھی۔ بنی اسرائیل کو سینیچر کے دن مچھلیوں کے شکار سے منع کیا گیا تھا۔ ان کی بستی سمندر کے کنارے پر واقع تھی۔ مچھلی کے شکار کے یہ عادی تھے۔ ان کی آزمائش کے لئے سینیچر کے دن ہر طرف سمندر میں مچھلیاں ہی مچھلیاں ان کو ملتی تھیں اور سینیچر گزرا اور ایک مچھلی پر بھی نظر نہیں پڑتی تھی۔ ان لوگوں نے حیلہ سازی کی کہ سینیچر کے دن سمندر کے قریب ایک گڑھا کھود کر پانی بھرکر اس میں مچھلیوں کو ہکا کر جمع کرلیتے اور اتوار کو خوب کھاتے۔ جو مومنین ان کے ساتھ رہتے تھے وہ ان کو بہت سمجھاتے اور اس حیلہ سازی سے منع کرتے تھے تو وہ مومنین جو ترک موالات کرچکے تھے۔ ان وعظ و نصیحت کرنے والی جماعت مومنین سے کہتے تھے کہ تم لوگ ایسی قوم کو کیا نصیحت کرتے ہو؟ جو اللہ کے عذاب میں پڑنے والے یا ہلاک ہونے والے ہیں۔ تو وہ کہتے تھے کہ ہم ان کے ساتھ کیوں ہیں

اس کیلئے ان کے رب کے آگے عذر پیش کرنے کیلئے کہ ہمارا مقصد ان کے ساتھ اسی قدر تھا کہ ان کو وعظ و نصیحت کرتے رہنے کا موقع ملے اور ہم امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ ادا کرتے ہیں اور پھر یہ امید کرتے ہیں کہ یہ سب نہیں تو ان میں سے کچھ ہی سہی اللہ سے ڈریں اور اپنی بدکرداریوں سے توبہ کریں۔

مگر جب باوجود وعظ و نصیحت اور احکام خداوندی کی یاد دہانی، عذاب الٰہی و باز پرس آخرت سے تخویف کے وہ سرکش اپنی بدکرداری سے باز نہ آئے تو اللہ تعالیٰ نے ان نصیحت کرنے والے مومنین کو اس عذاب سے بچالیا اور وہی لوگ اس عذاب میں پڑے جو اپنی جانوں پر آپ ظلم کررہے تھے۔ وہ کون ساخوفناک عذاب تھا اس کو بھی بتادیا کہ وہ بندروں کی فطرت میں مسخ کردیئے گئے۔

ان تین جماعتوں میں سے جو مومنین ان ظالموں سے ترک موالات کرکے الگ ہوچکے تھے ان کے متعلق کچھ کہنے کی ضرورت ہی نہ تھی کہ وہ بھی عذاب سے محفوظ رہے۔ وہ کیوں عذاب میں مبتلا ہوتے؟ نہ ان میں بدکرداری تھی نہ وہ بدکرداروں کے ساتھ تھے۔

البتہ جماعت مومنین مخلصین میں سے وہ لوگ جو ان بدکرداروں کے ساتھ ملے جلے رہتے تھے مگر ان کی بدکرداری میں شریک نہ تھے بلکہ ان کو بدکرداریوں سے روکتے، منع کرتے اور سمجھاتے رہتے تھے۔ خطرہ اگر تھا تو انہیں کے متعلق کہ ایسا نہ ہو عذاب آئے تو بدکرداروں کے ساتھ نیک کردار لوگ بھی اس میں مبتلا ہوجائیں۔ گیہوں کے ساتھ گھن بھی پس جائے۔ تو بتادیا گیا ایسا نہیں ہوا، ہم نے ان نصیحت کرنے والے مومنین

کو بچالیا۔ عذاب الٰہی یعنی بندر کی فطرت میں مسخ ہونے میں وہی لوگ مبتلا ہوئے جو بدکردار تھے۔

کس قدر صاف اور واضح چار مسلسل آیتیں ہیں۔ تینوں جماعتوں کا حال جن سے روز روشن کی طرح واضح ہے۔ حضرت ابن عباسؓ کو کس جماعت کے متعلق یہ خیال ہوا کہ "معلوم نہیں کہ ان کا حشر کیا ہوا۔ وہ عذاب میں پڑے یا ان کو نجات ملی؟" یہ سوال ان کے ذہن میں کس جماعت کے متعلق پیدا ہوا؟ فاسقین کو بائیکاٹ کرنے والے مومنین کے متعلق تو پیدا نہیں ہوسکتا تھا۔ یقیناً فاسقین کے متعلق پیدا ہوا ہوگا یا ان مومنین کے متعلق جو فاسقین کے ساتھ رہ کر ان کو وعظ و نصیحت کرتے رہتے تھے۔ تو دونوں کے متعلق صاف اعلان ہے کہ وعظ و نصیحت کرنے والے مومنین کو بچالیا گیا اور ظالموں کو مسخ کردیا گیا۔ پھر یہ سوال کیسا؟ اصل یہ ہے کہ عکرمہ صاحب کو قرآن مجید حفظ تو تھا نہیں۔ نہ قرآن مجید کی تلاوت کا معمول رکھتے تھے۔ درمیان آیت کا ایک ٹکڑا ذہن میں آگیا۔ مجمع تھا عوام کا اس کے متعلق ایک بات بناکر عوام کے سامنے کہدی جس سے اپنی بڑائی ظاہر ہو۔ مگر تعجب ہے کہ حافظ ابن حجر نے ان روایات کو ان آیات سے ملا کر کیوں غور نہیں فرمایا اور اس روایت کی تکذیب کیوں نہ کی۔ اس کا سبب وہی روایت پرستی ہے اس کی مثال اور بھی ملتی ہے اور مجھے یاد ہے کہ محدثین بعض وقت روایت لکھ لیتے ہیں مگر قرآن مجید کی آیت سے ملا کر غور نہیں کرتے۔ باوجودیکہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم تھا کہ جو حدیث ہم سے روایت کی جائے اس کو قرآن کے سامنے پیش کرو۔ قرآن کے مطابق ہو قبول کرو ورنہ رد کردو۔

تو جب اقوال منسوب بہ رسول کو بغیر قرآنی کسوٹی پر کسے قبول کرنا جائز نہیں تو آثار وصحابہ کو بغیر قرآنی کسوٹی پر کسے کس طرح محدثین ومفسرین قبول کرتے رہے ۔ تعجب ہی تعجب ہے۔

ان حالات میں جن لوگوں نے عکرمہ بربری جو حضرت ابن عباسؓ کے غلام تھے۔ جن کو حضرت ابن عباسؓ نے اپنی زندگی میں آزاد بھی نہیں کیا تھا۔ اگر ان کو یحییٰ بن سعیدالانصاری بعض ائمہ رجال نے کذاب لکھا اور امام مالک ان سے بیزار رہتے تھے تو کیا غلط تھا؟

اور عکرمہ کو کسی نے بھی قاری ومقری نہیں لکھا ہے۔ نہ ان کے ترجے میں کہیں مذکور ہے کہ ان سے ابو عمرو بن العلاء یا کسی نے بھی قرآن پڑھا تھا۔ اس لئے ان سے بھی ابو عمرو بن العلاء کا فن قرآت سیکھنا صحیح نہیں معلوم ہوتا۔ عکرمہ کی وفات کے متعلق مختلف اقوال ہیں۔ خود ان کی بیٹی کی روایت ۱۰۰ھ کی ہے ورنہ کسی نے ۱۰۵ھ کسی نے ۱۰۶ھ کسی نے ۱۰۷ھ اور کسی نے ۱۱۰ھ کہا ہے ۔ واللہ اعلم بالصواب

عبداللہ بن کثیر یہ ضرور قاری ومقری تھے اور کوفیوں کے قائم کردہ اسکول قرآت جو مکہ معظمہ کے کسی گوشے میں تھا اس کے ہیڈ ماسٹر تھے۔ ممکن ہے ابو عمرو ابن العلاء نے انہیں سے قرآت کا فن حاصل کیا ہو اور بصرے کے قاریوں نے ان کے اساتذہ قرآن کی ایک فہرست بنا رکھی ہو جس کے مطابق ابن حجر نے ان کے ترجے سے اپنی کتاب میں وہ فہرست درج کرلی ۔ ان کو کیا پڑی تھی کہ خواہ مخواہ اس کی کرید کرتے کہ یہ فہرست صحیح ہے یا نہیں۔ قاریوں میں سے ان کے متقدمین نے اپنے یا اپنے شیوخ کے متعلق جو کچھ ائمہ رجال سے بیان کیا انہوں نے اس کو لکھ

لیاکہ "اہل البیت ادری بما فیہ" قرات کے اسکول کا حال یہ قراہی ہم سے زیادہ جانتے ہیں جو ان اسکولوں کے ہیڈ ماسٹر یا کسی درجے کے ٹیچر یا اسٹوڈنٹ ہیں یا رہ چکے ہیں اس لئے اپنے متعلق یا اپنے متقدمین کے متعلق جو کچھ قاریوں نے بتایا ائمہ رجال نے لکھا۔ ابن حجر کا اس بناء پر کوئی قصور نہیں ہے کہ انہوں نے ابو عمرو بن العلاء کے شیوخ میں ایسے لوگوں کے نام کیوں لکھ دیئے جن سے ان کا قرآن پڑھنا مستبعد ہو۔

لیکن سوال ہے کہ جب عبداللہ بن کثیر کے خاص شاگرد بلاواسطہ ابو عمرو بن العلاء تھے تو پھر عبداللہ بن کثیر کے جانشین اور ان کی قرآت کے راوی دوسری جگہ سے مستعار کیوں لئے گئے؟ ابو عمرو بن العلاء ہی نہیں بلکہ مکے کے رہنے والے شبل بن عباد المکی بھی عبداللہ بن کثیر کے شاگرد تھے اور شجاع بن ابی النصر البلخی ابو النعیم المقری نے بھی قرآت کا فن عبداللہ بن کثیر سے سیکھا تھا لیکن شجاع اور شبل یہ دونوں کسی کے آزاد کردہ غلام نہیں تھے۔ قرآن پڑھنے کے لئے آئے سیدھا سادہا قرآن جس طرح سب مسلمان پڑھتے تھے پڑھا دیا گیا۔ ان کو وہ اختلافات کا گر نہیں بتا سکتے تھے۔ اور ان آزادوں پر اتنا اعتماد بھی نہ تھا کہ یہ دونوں سازش میں شریک ہونگے اس لئے یہ جانشینی کے قابل نہ تھے۔ اور ابو عمرو بن العلاء خود بصرے کے اسکول کے ہیڈ ماسٹر بنائے گئے تھے۔ وہاں سے لاکر مکے کے اسکول میں ان کو بٹھادیا جاتا تو پھر بصرے کے لئے کسی کارآمد دوسرے آزاد کردہ غلام کی تلاش کرنی پڑی اور سازش میں شریک ہونے والے قابل اعتماد لوگوں کا زیادہ ملنا کچھ آسان نہ تھا۔ اس لئے مستعار ہی سہی - کام چلانے کے لئے ایک شاگرد کے شاگرد کو پکڑ لیا گیا اور ایک

دوسرے کے شاگرد کو مستعار لے لیا گیا۔ اور اس طرح مکہ اور بصرہ دونوں جگہ کے اسکول چالو بنا لئے گئے۔

(۴) عبداللہ بن عامر

(ولادت ۲۱ھ وفات ۱۱۸ھ)

زیادہ تر ائمہ رجال تو ۲۱ ھ ہی میں لکھتے ہیں مگر ان کے ایک شاگرد خالد بن یزید بن صالح بن صبیح المری نے ان کا سال ولادت ۸ ھ بیان کیا ہے مگر حافظ ابن حجر نے اس کو رُوِی کہہ کر ضعیف قرار دیا ہے۔ اس قول کا ضعف اس سے بھی ظاہر ہے کہ یہ نہیں معلوم کہ خالد بن یزید المری نے کس سے کہا تھا اور کس ذریعہ سے یہ روایت حافظ ابن حجر تک پہنچی اور خود خالد بن یزید کو اس کا سال ولادت کس سے معلوم ہوا؟ مگر مودودی صاحب نے اسی ضعیف قول کو نقل کیا ہے۔ اس حساب سے ان کی عمر ایک سو دس (۱۱۰) برس کی ٹھہرے گی مگر ائمہ رجال ان کو معمر لوگوں میں لکھتے نہیں ہیں۔ واللہ اعلم۔

ابن حجر تہذیب التہذیب جلد ۵، صفحہ ۲۷۴ میں لکھتے ہیں کہ انہوں نے قرآن مجید مغیرہ بن ابی شہاب سے پڑھا تھا۔ مودودی صاحب لکھتے ہیں مغیرہ بن شہاب .بہرحال جناب مغیرہ ممدوح کے والد ماجد شہاب ہوں یا ابو شہاب . لیکن ائمہ رجال شہاب یا ابی شہاب کے صاحبزادے جناب مغیرہ کا کہیں ذکر نہیں کرتے ہیں ۔ لے دے کے بس عبداللہ بن عامر کے ترجے میں لکھ دیتے ہیں کہ انہوں نے مغیرہ بن ابی شہاب سے قرآن پڑھا تھا۔ افسوس ہے کہ عبداللہ بن عامر کو صحابہؓ میں سے کوئی بھی

ایسا نہ ملا جو ان کو قرآن پڑھا دیتا۔ انہوں نے قرآن پڑھنے کے لئے چنا بھی تو ایک غیر معروف مجہول الحال ہی شخص کو۔ اور مغیرہ بن ابی شہاب کے سوا اور کسی سے ان کے قرآن پڑھنے کا کوئی بھی ذکر نہیں کرتا۔ تیسیر میں ابو عمرو الدانی نے ان کا ایک استاد اور ڈھونڈ نکالا ہے۔ یعنی ابو درداء عویمر بن عامر مشہور صحابیؓ اور پھر مغیرہ بن ابی شہاب المخزومی کا نام لکھتے ہیں جو ایک مجہول الحال نامعلوم شخص تھے۔ لکھتے ہیں کہ انہوں نے حضرت عثمانؓ سے قرآن پڑھا تھا۔ پھر یہ بھی لکھتے ہیں کہ بعضوں نے کہا ہے کہ عبداللہ بن عامر نے بذات خود حضرت عثمانؓ سے قرآن پڑھا تھا۔ پھر یہ بھی لکھتے ہیں کہ یہ صحیح نہیں ہے۔ پھر لکھتے ہیں کہ شیخ ابو علی نے ہمیں خبر دی ہے کہ یہ صحیح ہے یعنی عبداللہ بن عامر کا حضرت عثمانؓ سے بذات خود قرآن مجید پڑھنا صحیح ہے۔ مگر یہ شیخ ابو علی کون ہیں؟ بغیر کسی تصریح کے ان کی شخصیت کس طرح متعین کی جائے اور پھر اس کو قاری و مقری بھی ہونا چاہئیے اور ابو عمرو الدانی کا ہمعصر ہونا بھی ضروری ہے تاکہ ابو عمرو الدانی کو وہ خبر دے سکے کسی نے سچ کہا ہے من جد و جد جوئندہ یابندہ۔ تھوڑی سی جستجو کے بعد میں نے شیخ ابو علی صاحب کا پتہ لگالیا۔ اب مجھ سے سنئے۔ ان ابو علی صاحب کا نام حسن بن قاسم ہے اور ان کا لقب "غلام الہراس" مشہور ہے۔ اہل عراق کے قاری تھے۔ ۳۷۴ھ میں پیدا ہوئے اور ۴۶۸ھ میں وفات پائی۔ ابو عمرو الدانی کی وفات ۴۴۴ھ میں ہے اس لئے دونوں میں ملاقات ہو سکتی ہے۔ انہی

نے ابو عمرو الدانی سے کہا ہوگا۔ مگر یہ کوئی معتمد علیہ شخص نہ تھے۔ اس لئے پہلے یہ لکھ دیا کہ حضرت عثمانؓ سے عبداللہ بن عامر کا قرآن پڑھنا جو بعض لوگ بیان کرتے ہیں صحیح نہیں ہے اس کے بعد ان کا قول بھی نقل کردیا۔ مگر سوال یہ ہے کہ کیوں صحیح نہیں ہے جب ۸ ھ میں پیدا ہوئے تھے تو حضرت عثمانؓ کی شہادت کے وقت چھبیس ستائیس برس کے ہوں گے۔ تئیس چوبیس برس کی عمر میں ممکن ہے کہ انہوں نے حضرت عثمانؓ سے قرآن پڑھا ہو۔ لیکن حضرت عثمانؓ کی شہادت ۳۵ ھ میں ہے۔ اور حضرت ابو الدرداءؓ کی وفات ۳۲ ھ میں ہے۔ حضرت عثمانؓ کی شہادت سے دو ڈھائی برس پہلے۔ اس لئے اگر یہ عثمانؓ سے قرآن

---

(۱) ابن حجر لسان المیزان ج ۲، صفحہ ۲۳۵ میں ابو علی غلام الہراس حسن بن قاسم کا ترجمہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ "ابو الفضل بن خیرون نے ذکر کیا ہے کہ ابو علی کے قرآتوں میں کچھ خلط ملط کیا ہے اور بعض ایسے استاد کا دعویٰ کیا ہے جن کی کوئی اصلیت نہیں اور عجیب عجیب باتیں روایت کی ہیں۔ کسی نے ابو الفضل بن خیرون سے ایک بار ابو علی غلام الہراس کے بارے میں پوچھا کہ یہ ابوعلی الاہوازی سے روایت کرتے ہیں تو انہوں نے ابو غلام الہراس کے بارے میں کہا کہ یہ "سکھایا پڑھایا شخص ہے۔ بڑا جھوٹا ہے ایک بڑے جھوٹے سے روایت کرتا ہے۔" یعنی ابو علی غلام الہراس بھی کذاب ہے اور ابو علی الاہوازی بھی کذاب ہے۔ اور دونوں مشہور قاری ہیں۔ دونوں سے قرآتوں کی روایتیں قرآت کی کتابوں میں مذکور ہیں۔ ابو علی غلام الہراس کے ایک ہی شاگرد ابوالعز القلانسی کا ذکر ابن حجر نے کیا ہے مگر ان کا ذکر کہیں نہیں کیا ہے۔ نہ سمعانی۔ نہ ذہبی کوئی بھی ان کا ذکر نہیں کرتا غرض یہ بھی مجہول الحال ہیں۔ صرف ہبۃ اللہ بن المبارک سقطی نے ان کی بڑی مدح کی ہے مگر سمعانی اور ابن حجر نے لکھ دیا ہے کہ سقطی کے سوا جمہور غلام الہراس ابو علی کو کچھ اور کہتے ہیں جو سقطی کے قول کے خلاف ہے مگر یہ سقطی صاحب خود غلام الہراس سے زیادہ اعتبار سے ساقط ہیں۔ ابن حجر نے لسان المیزان جلد ۶، صفحہ ۱۸۹ سے صفحہ ۱۹۰ تک ان کا مفصل حال لکھ دیا ہے یہ ایسے لوگوں سے اپنی قرآت کی سند جوڑتے تھے جو ان کی پیدائش سے پہلے مر چکے تھے۔ بڑے جھوٹے تھے اس لئے نہ ان کی مدح کا اعتبار نہ ان کی قدح کا۔

نہیں پڑھ سکتے تھے تو پھر حضرت ابو الدرداءؓ سے بھی نہیں پڑھ سکتے تھے۔ اصل یہ ہے کہ ان کی عمر زیادہ کرنے کے لئے یہ روایت گھڑی گئی ہے کہ ان کی ولادت ۸ ھ میں ہوئی تھی تاکہ حضرت ابو الدرداءؓ اور حضرت عثمانؓ سے ان کا قرآن پڑھنا ممکن قرار دیا جاسکے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ ان کی ولادت ۲۱ ھ میں ہوئی۔ یہ تو کوئی حدیث بھی حضرت ابوالدرداءؓ یا حضرت عثمانؓ یا حضرت علیؓ سے روایت نہیں کرتے۔ پورا قرآن مجید ان میں سے کسی سے بھی کس طرح پڑھ سکتے تھے۔ بچپن میں یہ اپنے وطن دمشق میں رہے۔ تابعی تھے۔ متاخرین صحابہ سے حدیثیں روایت کرتے تھے۔ انہوں نے تو حضرت عثمانؓ یا حضرت ابوالدرداءؓ کو دیکھا بھی نہ ہوگا بلکہ حضرت علیؓ کی زیارت بھی نصیب نہ ہوئی ہوگی۔ تیسیر میں حضرت ابوالدرداءؓ سے ان کے قرآن پڑھنے کا ذکر سند کے لئے کافی نہیں ہوسکتا اور نہ خالد بن یزید بن صالح سے بے سند روایت کہ ان کی پیدائش ۸ ھ میں ہوئی تھی جمہور ائمہ رجال کے خلاف قابل تسلیم ہے۔

ابن جحران کے ترجمہ میں لکھتے ہیں کہ ان سے اسماعیل بن عبداللہ بن ابی المہاجر نے قرآن پڑھا تھا اور ابو عبیداللہ مسلم بن مشکم نے اور یحییٰ بن الحارث الذماری نے بھی۔ ابن الندیم نے "الفہرست" میں ان کے بھائی عبدالرحمن بن عامر کو بھی ان کا شاگرد لکھا ہے اور سعید بن عبدالعزیز اور ہشام بن عمار اور ثور بن یزید کو بھی۔ ابو عمرو الدانی نے تیسیر صفحہ ۵ میں لکھا ہے کہ "قراء سبعہ میں سے ابن عامر الشامی یعنی یہی عبداللہ بن عامر الحیصبی اور ابو عمرو کے سوا کوئی بھی خالص عرب نہیں تھے۔ سب موالی یعنی آزاد کردہ غلام تھے۔" ابو عمرو یعنی ابو عمرو بن العلاء

بن عمار بن عبداللہ بن الصحین بن الحارث بن الجلہم بن خزاعی بن مالک بن عمرو بن تمیم۔ ابو عمرو کا نام ریان یا عریان یا یحییٰ بتایا ہے یعنی یہ تمیمی بنی تمیم سے تھے۔ اس لئے عربی تھے۔ ابو عمرو بن العلاء نے تو ۱۵۴ھ میں کوفہ میں وفات پائی تھی اور عبداللہ بن عامر نے ۱۱۸ھ میں دمشق میں وفات پائی تھی۔ ابو عمرو بن العلاء تو کوفے ہی میں رہتے تھے۔ اہل کوفہ کی صحبت میں رہ کر "ہر کہ درکان نمک رفت نمک شد" کے مطابق کوفیوں کے رنگ میں رنگ گئے تھے۔ ان کا مفصل حال آپ پہلے سن چکے۔ عبداللہ بن عامر بہت متقدم ہیں۔ دمشق والوں نے ان کا صرف نام استعمال کیا ہے۔ جہاں تک قیاس رہنمائی کرتا ہے اس کی امید نہیں ہوئی کہ یہ خود اختلافات قرآت کی سازش میں شریک ہوں۔ خصوصاً جب یہ موالی میں سے بھی نہ تھے۔ خالص عرب تھے۔ جیسا کہ ابو عمرو الدانی نے لکھا ہے۔ مگر ابن السمعانی نے لفظ یحصبی کے تحت میں عبداللہ بن عامر کا کوئی ذکر نہیں کیا ہے وہ لکھتے ہیں کہ یحصب قبیلہ حمیر کی ایک شاخ تھی یہ لوگ حمص میں رہتے تھے۔ بعضوں نے یہ بھی کہا ہے کہ یحصب ایک قریہ تھا حمص کا۔ سمعانی لکھتے ہیں کہ مگر پہلا ہی قول صحیح ہے ممکن ہے یحصبیون کا قبیلہ حمص کے جس قریہ میں رہتا ہو وہ قریہ انہیں کے نام سے مشہور ہوگیا ہو۔ بہرحال نہ یہ قریشی تھے نہ حجاز کے رہنے والے تھے۔ اس لئے ان کو عرب کہدینے سے دھوکہ نہیں کھانا چاہئیے۔ غایت سے غایت موالی میں سے نہ تھے۔ یعنی کسی کے غلام آزاد کردہ نہ تھے۔ مگر نہ یہ ضروری ہے کہ جتنے موالی ہوں وہ سب قرآن واسلام کے خلاف سازش میں شریک ہوں۔ اور نہ یہ ضروری ہے کہ جتنے خالص عرب بلکہ حجازی

بلکہ قریشی ہوں وہ سب پکے مومن اور مخلص مسلم ہوں۔ ان کے دلوں میں ملحدانہ خیالات نہیں آسکتے۔ اچھے برے ہر طبقے، ہر قبیلے اور ہر جگہ کے لوگ ہر زمانے میں کم وبیش رہے ہیں۔ آخر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ مبارک میں خاص مدینے والوں میں بھی کچھ جگہ منافقین تھے۔ جس کی شہادت خود قرآن مبین دے رہا ہے۔ مختصر یہ کہ سات میں سے صرف دو کے عرب ہونے پر فخر کرنا یا اس کو غنیمت سمجھنا صحیح نہیں جبکہ پانچ کے موالی میں سے ہونے کا خود اعتراف ہے۔ پھر بھی میں عبداللہ بن عامر کو اختلاف قرآت کی سازش میں شریک نہیں سمجھتا ہوں بلکہ سمجھتا ہوں کہ شامیوں نے ان کو اپنی سازش میں شریک کرلیا ہے۔ ان کو بھی نہیں بلکہ ان کے نام کو ان کی وفات کے بعد۔ کیونکہ ان کی وفات کے وقت تک تو کوفے کے خاص خاص گھروں اور خاص خاص محلوں میں اختلاف قرآت کی کھچڑی چپکے چپکے پک رہی تھی اور روایتیں بن رہی تھیں۔ اسناد جوڑے جارہے تھے۔ الفاظ قرآنی کے اعراب اور نقطے کہیں رسم الخط کہیں الفاظ بدل بدل کے لکھے جارہے تھے۔ عبداللہ بن مسعودؓ اور ابی بن کعب وغیرہ رضی اللہ عنہم کے مصاحف مرتب کئے جارہے تھے۔ زیادہ سے زیادہ غیر منقوط بغیر اعراب کے مصاحف پرانے کاغذات پر لکھے جارہے تھے جن کی کتابت صحابہؓ میں سے کسی کی طرف منسوب کی جارہی تھی۔ یہ ثابت کرنے کیلئے کہ ابتداء ہی سے قرآن غیر منقوط بغیر اعراب کے چلا آرہا ہے۔ غرض ۱۱۸ھ کا زمانہ مختلف قرآتوں کی اشاعت کا نہ تھا بلکہ اشاعت کے لوازمات مہیا کرنے کا تھا۔ باقی رہا صرف قرآن کا پڑھنا یا پڑھانا۔ اس کا تو مدرسہ ہر مسلم گھر میں موجود تھا۔

ہر باپ اپنی اولاد کو، ہر شوہر اپنی بیوی کو اور ہر آقا اپنے غلاموں اور لونڈیوں کو قرآن پڑھاتا تھا۔ کسی قاری و مقری کی کہیں کوئی ضرورت ہی نہ تھی بجز ان ممالک کے جو فتح ہوتے جارہے تھے۔ اور جہاں اسلام اس وقت پھیل رہا تھا وہاں کے نو مسلموں کے لئے البتہ تعلیم قرآن کیلئے قاریوں اور مقریوں کی ضرورت تھی۔

اچھا اب عبداللہ بن عامر سے جن لوگوں نے اپنایا دوسروں نے ان کا رشتہ تلمذ جوڑا ہے ان سے بھی کسی قدر تعارف حاصل کرلیجئے۔ تاکہ شامی اسکول قرآت کا حال بھی آپ کو معلوم ہوجائے مگر پہلے ایک بات سن لیجئے۔

<u>اہلحدیث اور قراء کا فکری اتحاد</u> محدثین میں جامعین صحاح یا امام مالک امام احمد بن حنبل اور ان جیسے اکابر محدثین رضی اللہ عنہم اجمعین کی دیانت وخلوص میں ان کی وثاقت وعدالت میں کسی طرح کا شبہ نہیں کیا جاسکتا۔ اسی طرح ائمہ رجال کی تفتیش و تحیص اور دیانتدارانہ تحقیق و تدقیق سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا۔ مگر یہ سب حضرات انسان تھے اور انسان کی فطرت میں بھول چوک بھی ہے اور رعایت و مروت بھی ہے۔ محبت و عداوت بھی ہے اور بہت سی انسانی کمزوریاں بھی ہیں۔ ان محدثین وائمہ رجال رحمہ اللہ کو تمام انسانی کمزوریوں سے پاک و منزہ سمجھنا غلط ہی نہیں گناہ بھی ہے اور درحقیقت گناہ کبیرہ ہے۔ محدثین میں جو جامعین سنن ہیں یہ اس زمانہ کے لوگ ہیں جب فرقہ بندی مسلمانوں میں پیدا ہوچکی تھی۔ اس لئے فرقہ وارانہ تعصب ان میں نمایاں تھا۔ اکثر محدثین شافعی تھے۔ حنفیوں کے ساتھ ان کا تعصب کوئی ڈھکی چھپی بات

نہیں ہے۔ امام بخاری رحمہ اللہ شافعی تھے اسلئے امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کی طرف سے کچھ کھچاؤ رکھتے تھے۔ چنانچہ اپنی کتاب تاریخ صغیر میں ایک روایت لکھ گئے کہ نعیم بن حماد نے ہم سے بیان کیا کہ ہم سے فزاری نے کہا کہ میں سفیان (ثوری) کے پاس تھا کہ نعمان (امام ابو حنیفہ) کی وفات کی خبر پہنچی۔ تو سفیان نے کہا کہ الحمد للہ! اس شخص نے اسلام کی دھجیاں اڑا کر رکھ دی تھیں۔ اسلام میں اس سے زیادہ منحوس آدمی پیدا نہ ہوا۔" (تاریخ صغیر صفحہ ۱۷۴ مطبوعہ انوار احمدی الہ آباد) حالانکہ نعیم بن حماد کو خود امام بخاری رحمہ اللہ نے کتاب الضعفاء الصغیر صفحہ ۲۹ میں ضعیف لکھا ہے اور مشہور شارح صحیح بخاری حافظ ابن حجر تہذیب التہذیب جلد ۱۰ صفحہ ۴۶۲ میں اس نعیم بن حماد کو کذاب لکھتے ہیں اور صاف طور سے تحریر فرماتے ہیں۔ وہ دو جگہ صفحہ ۴۶۲ میں بھی اور صفحہ ۴۶۳ میں بھی کہ **کان یضع الحدیث فی تقویۃ السنۃ و حکایات فی ثلب ابی حنیفہ کلھا کذب** یعنی "نعیم بن حماد سنت کی تقویت کے لئے حدیثیں گھڑا کرتے تھے اور (امام) ابو حنیفہ کی تنقیص میں حکایتیں گھڑا کرتے تھے اور وہ سب جھوٹی ہوتی تھیں۔" اور فزاری صاحب جن کا نام مروان بن معاویہ ہے وہ بھی نعیم بن حماد سے کچھ کم نہ تھے مجہول لوگوں سے غلط سلط روایتیں کرتے تھے اور کبھی راویوں کے نام بھی بدل دیتے تھے اس لئے ان کے معروف و مجہول دونوں قسم کے شیوخ مشتبہ ہی حال میں تھے۔ چنانچہ ابن حجر تہذیب التہذیب جلد ۱، صفحہ ۱۶۰ میں لکھتے ہیں کہ یہ ابراہیم بن محمد سے روایت کرتے تھے مگر نام بدل کے یعنی ابراہیم کو عبدالوہاب قرار دے کر۔ مگر جلد ۱۰، صفحہ ۹۸ میں ان کے اوصاف حسنہ

کی تصریح کی ہے۔ غرض ائمہ حدیث ہوں یا ائمہ رجال کمزوریوں سے وہ بری نہ تھے۔ وہ ان قاریوں کی ریشہ دوانیوں کو دیکھ رہے تھے اور ایک حد تک سمجھتے بھی تھے مگر سازشیوں کی ایک بہت بڑی جماعت خود ان کے ساتھ بھی محدثین کی جماعت بن کر لگی ہوئی تھی جن میں سے کچھ ان کے تلامذہ تھے تو کچھ ان کے شیوخ واساتذہ بھی تھے۔ کچھ ان کے کاتب اور وراق (دفتری) تھے تو کچھ دوست احباب بھی تھے اور وہ سب قاریوں کے حامی تھے۔ اس لئے ان قاریوں کے خلاف کچھ بول نہیں سکتے تھے۔ بلکہ اختلاف قرآت کی کچھ روایتیں اپنی کتابوں میں لکھ لینے پر بھی مجبور ہوجاتے تھے۔ اور اگر وہ جامعین خود اپنی کتابوں میں اسی قسم کی روایتیں درج نہیں کرتے تھے تو ان کے کاتب ان کے وراق جن میں اکثریت سازشی ہی لوگوں کی تھی اور ان کے سازشی تلامذہ ان کے بعد ان کی کتابوں میں داخل کرکے ان کتابوں کی متعدد نقلیں کراکے مختلف جگہ پھیلا دیتے تھے۔ تاکہ وہی سازشی نسخہ کثیرالاشاعت ثابت ہوکر صحیح سمجھا جائے۔ جن کے پاس اصل نسخے کی صحیح نقل ہو بھی تو وہ اپنی کتاب میں ان حدیثوں کی کمی سمجھ کر ان کو اپنی کتابوں میں داخل کرلیں۔ اگر محدثین قاریوں کی ان ریشہ دوانیوں کو اچھی نظر سے دیکھتے تو خود حدیث سے زیادہ اختلاف قرآت قرآن میں اس سرگرمی سے حصہ لیتے جس سرگرمی سے قاریوں کی جماعت حصہ لے رہی تھی ورنہ ان محدثین کا تعلق ان قرآء سبعہ کے ساتوں اسکولوں سے کیوں نہ ہوا؟ ان لوگوں نے ان اسکولوں میں سے کسی اسکول میں کیوں قرآن نہیں پڑھا؟ محدثین سے تو ایک دنیا آباد نظر آتی ہے اور قاریوں کو انگلیوں پر گن لیا جاسکتا ہے؟ کسی اسکول کے ہیڈ ماسٹر کو

دو ایک سے زیادہ اسٹوڈنٹ نہیں ملے۔ ادھر ادھر سے مانگے کے شاگرد وجانشین مہیا کئے جاتے رہے۔ یہ افلاس ان قاریوں میں آخر کیوں تھا؟ اس کی وجہ یہی تھی کہ عام طور سے مخلص مسلمانوں کو ان کی یہ ریشہ دوانیاں کچھ بھلی نہیں معلوم ہوتی تھیں۔ ابتداء میں جب تک سازش کو سازش نہیں سمجھے تھے انزل الفرقان علی سبعة احرف والی حدیث اور بعض اختلاف قرآت کی روایتیں لکھی تھیں یا ان کی کتابوں میں داخل کردی گئی تھیں۔ ان کو دیکھ کر بعد والے محدثین اور عامہ مسلمین ان کو صحیح سمجھ کر چپ تھے اور ان حدیثوں کو احادیث متشابہات سمجھ کر ان پر ایمان رکھتے تھے مگر جب اختلافات قرآت کا انبار لگنے لگا تو محدثین اور ان کے ساتھ عام مسلمانوں کی ایک بڑی جماعت ان سے الگ تھلگ ہی رہی۔

ائمہ رجال بعض قاریوں کے حالات سے واقف نہ تھے تو دوسرے قاریوں سے پوچھ لیا کرتے تھے جو کچھ وہ بتا دیتے تھے یہ لکھ لیا کرتے تھے۔ "دروغ گو را حافظہ نباشد" بات اگر صحیح ہو تو جس سے بھی پوچھئے سب ایک ہی بات کہیں گے مگر جھوٹی بات میں ضرور اختلاف ہوگا۔ اس لئے کسی نے کسی کو کسی کا شاگرد لکھوادیا۔ کسی نے کسی کا کسی نے کسی کو کسی کا شاگرد لکھوادیا دوسرے نے اس کا الٹا لکھوادیا۔ کہ وہی شاگرد تھے اور یہی استاد تھے۔ ان باتوں کو ذہن نشین رکھتے ہوئے اب سنئے۔

اسماعیل بن عبیداللہ بن ابی المہاجر کے متعلق ابن حجر تہذیب التہذیب جلد ۵، صفحہ ۲۷۴ ترجمہ عبداللہ بن عامر بن یزید الحصبی المقری الدمشقی میں لکھتے ہیں قرآعلیہ اسماعیل بن عبیداللہ بن ابی المہاجر

و ابو عبید الله مسلم بن مشکم و یحییٰ بن الحارث الذماری - ان کے ترجمے میں اس سے صاف ثابت ہورہاہے کہ اسماعیل بن عبداللہ بن ابی المہاجر شاگرد تھے اور عبداللہ بن عامر استاد۔ مگر جلد ۱، صفحہ ۳۱۷ ترجمہ اسماعیل بن عبیداللہ بن ابی المہاجر المخزومی جو مخزومیوں کے غلام آزاد کردہ تھے۔ مگر نہ ان کو قاری لکھاہے نہ مقری، نہ یہ قرآت کے فن میں کسی کے استاد تھے نہ شاگرد۔ اور حضرت انسؓ جیسے متعدد صحابہؓ سے حدیثیں روایت کرتے ہیں اگر ان کو قرآن پڑھنا ہی تھا تو صحابہ کو چھوڑ کر ایک دمشقی سے قرآن مجید پڑھنے کی انہیں کیا ضرورت تھی۔ اگرچہ یہ خود بھی دمشقی ہی تھے۔ بس صرف دونوں کو دمشقی دیکھ کر جو سن میں کم تھا اس کو شاگرد اور بڑے کو استاد قرار دے کر سلسلہ جوڑ دیا۔ حالانکہ یہ تو عبداللہ بن عامر سے کوئی حدیث بھی روایت نہیں کرتے۔

اور سنئے ہتذیب التہذیب جلد ۷، صفحہ ۲۲۸ عطیہ بن قیس الکلابی الدمشقی جو بنی عامر کے غلام آزاد کردہ تھے ان کے ترجمے میں ابن حجر لکھتے ہیں بروایت عبدالواحد بن قیس (جو عروہ بن الزبیر یا عمرو بن عتبہ کے غلام آزاد کردہ تھے) کہ " لوگ اپنے مصاحف کو عطیہ بن قیس کی قرآت کے مطابق درست کرلیا کرتے تھے۔" یعنی عطیہ اس قدر مسلم الثبوت قاری تھے کہ لوگوں کو اپنے مصاحف پر جو یقینی بقول قراء مصحف عثمانی ہی ہوگا یا شاید مصحف عبداللہ بن مسعود یا مصحف ابی بن کعب کے مطابق لیکن ان میں سے کسی مصحف پر لوگوں کو اعتماد باقی نہ رہا تھا۔ جو قرآت عطیہ بن قیس نے اختیار کی تھی وہی قرآت سارے اہل دمشق کو بقول عبدالواحد بن قیس پسند آگئی تھی۔ مگر خود عطیہ نے یہ قرآت جو

دمشق میں اس قدر مقبول تھی کس سے حاصل کی تھی اس کا مطلق ذکر نہیں۔ حدیثیں یہ حضرت ابی بن کعب سے روایت کرتے تھے ان کا ذکر ضرور ہے۔ ان سے قرآن پڑھنے کا ذکر نہیں تو پھر ان کا وہ کون سا مصحف تھا کہ سارے دمشقیوں نے ان کے مصحف پر اپنے مصاحف کو قربان کردیا؟ حقیقت یہ ہے کہ یہ عبدالواحد صاحب کی دروغ بافی اور اپنی پارٹی کے آدمی کا پروپیگنڈہ ہے اور کچھ نہیں عبدالواحد بھی دمشقی اور عطیہ بھی دمشقی۔ عطیہ بھی ایک غلام آزاد کردہ اور عبدالواحد بھی ایک غلام آزاد کردہ - اس لئے اگر یہ سازش قرآت کے ارکان کا پروپیگنڈہ کریں تو کیا بعید از عقل ہے اور یہ عبدالواحد تھے بھی ایسے ہی کہ عجیب عجیب حدیثیں روایت کیا کرتے تھے۔ مشہور محدثین سے منکر حدیثیں "حدثنا" کہہ کر روایت کرتے تھے۔ حضرت ابوہریرہؓ کو دیکھا تک نہ تھا، مگر ان سے بے محابا روایت کیا کرتے تھے۔ اسی لئے محدثین نے ان کو متروک الحدیث لکھا ہے۔ تو پھر ان سے اپنی سازشی پارٹی کا جھوٹا پروپیگنڈہ کیا بعد از عقل ہے؟

(ان کے حالات تہذیب التہذیب جلد ۶، صفحہ ۴۳۹ میں دیکھئے)

۵- عاصم بن ابی النجود الکوفی

ان کو عاصم بن بہدلہ کہتے ہیں - اسدیوں کے آزاد کردہ غلام تھے - اس لئے اسدی کہے جاتے ہیں۔ زر بن جیش الکوفی اور ابو عبدالرحمن السلمی سے قرآت حاصل کی اور ان سے اعمش اور منصور بن المعتمر روایت کرتے ہیں یہ دونوں ان کے قرابت مند بھی تھے (دونوں شیعے تھے کوفے

میں بنی اسد کا اور ہمدانیوں کا محلہ خاص شیعوں کا محلہ تھا۔ اس لئے آپ ان عاصم صاحب کو بھی سمجھ سکتے ہیں کہ یہ کیا تھے۔ اور ان کے پروردہ اور شاگرد حفص کیا تھے) مگر ان کو لکھا ہے کہ کان عثمانیاً یعنی حضرت عثمانؓ کے حمایتیوں میں سے تھے۔ قوم کی اکثریت میں اعتبار و اعتماد پیدا کرنے کے لئے متعدد اسدی وہمدانی اور دوسرے اہل کوفہ ازروئے تقیہ عثمانی بن گئے تھے۔ مگر حدیث اپنے اصل مسلک کی بہت روایت کرتے تھے اس لئے خاص کر اسدیوں اور ہمدانیوں کے عثمانی بن جانے یا اپنے کو اہل سنت ظاہر کرنے سے دھوکا نہیں کھانا چاہئیے۔ محدثین نے لکھا ہے کہ حافظے کے بہت کمزور تھے حدیثیں یاد نہیں رکھتے تھے اسلئے ان کی حدیثوں میں نکرہ ہوتی تھی۔ ابن حجر لکھتے ہیں کہ حاتم نے کہا کہ **عندی محله الصدق صالح الحديث وليس محله ان يقال هو ثقه** یعنی سچے تھے درست حدیثوں والے مگر ان کا یہ مقام نہیں ہے کہ ان کو ثقہ یعنی قابل وثوق کہا جائے (تعجب ہے ۔سچے بھی تھے ۔ صالح الحدیث بھی تھے۔ تو اب ان کے ثقہ ہونے میں کون سی کسر رہ گئی تھی) چونکہ بخاری و مسلم میں ان کی روایتیں ہیں اس لئے ان پر رجال والے کھل کر کچھ لکھ نہیں سکتے۔ پھر کوفے کے قاریوں کے سرگروہ بھی تھے۔ ۱۲۷ھ یا ۱۲۸ھ میں ان کی وفات ہوئی۔

اساتذہ عاصم قرآت میں عاصم بن بہدلہ کے دو استاد تھے اور دونوں کوفی۔ ابو عبدالرحمن السلمی الکوفی جن کا نام عبداللہ بن حبیب بن ربیعہ ہے (بصیغہ تصغیر) جنگ صفین میں تو حضرت علیؓ کے ساتھ تھے مگر حضرت علی کی شہادت کے بعد خلافت جب حضرت معاویہؓ کی طرف

منتقل ہوگئی تھی تو عثمانی بن گئے تھے۔ رہے برابر کوفہ میں اور وہیں وفات پائی۔ ان کے والد ماجد حبیب بن ربیعہ السلمی صرف انہیں کے بیان کے باعث صحابی سمجھے جاتے ہیں ۔ خود ان کے سوا کسی اور کی شہادت ان کے والد کے صحابی ہونے کی نہیں ملتی۔ خود حضرت عمرؓ حضرت عثمانؓ حضرت حذیفہ بن الیمانؓ، حضرت عبداللہ بن مسعودؓ اور حضرت علی رضی اللہ عنہم اجمعین سب سے روایت کرتے ہیں۔ اس لئے ان سب روایتوں کو صحیح ثابت کرنے کے لئے ان کی تاریخ وفات کی تعین میں لوگوں نے بہت اختلاف کیا ہے اور جن کو اس کی فکر نہ تھی ان لوگوں نے صاف انکار کردیا ہے کہ حضرت عمرؓ تو بہت پہلے گزرے حضرت عثمانؓ اور حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے بھی انہوں نے کچھ نہیں سنا۔ تو پھر حضرت حذیفہ بن الیمانیؓ سے بھی ان کا کچھ سننا قرین عقل نہیں۔ مگر ان کا ہر صحابی سے سماع ثابت کرنے کے لئے بعد والوں نے بہت کوشش کی ہے ان کا سال وفات کوئی ۷۰ ھ، کوئی ۷۲ ھ اور کسی نے ۸۵ ھ لکھا ہے اور آخر الذکر نے ان کی عمر نوے برس بتائی ہے اگر نوے برس کی عمر پائی اور ۸۵ ھ میں وفات پائی تو وفات نبوی کے وقت ان کو پندرہ برس کا ہونا چاہئے اور صحابہ میں ان کا ذکر ہوتا اور اگر ۷۰ ھ یا ۷۲ ھ میں وفات پائی اور عمر نوے برس کی ہوئی تھی تو وفات نبوی کے وقت ان کو پچیس برس کا ہونا چاہئیے اور صحابہ میں ان کا ذکر ہوتا۔ ۷۰ ھ میں نوے برس کی عمر میں ان کا انتقال اس لئے بیان کیا گیا کہ حضرت عمرؓ حضرت عثمانؓ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہم سے ان کا سماع بھی ثابت ہو اور عاصم بن بہدلہ کا ان سے قرآت سیکھنا بھی ثابت ہو۔ ۷۲ ھ میں اگر ان

کی وفات مان لی جائے اور عاصم بن بہدلہ کی وفات اگر ۱۲۷ھ ہی مان لیجئے تو دونوں کی وفات کے درمیان ۵۵ برس کا فاصلہ پڑتا ہے۔ خزرجی نے خلاصہ تہذیب التہذیب الیمانی میں عاصم بن بہدلہ کا سال وفات بروایت ۱۲۹ھ لکھا ہے اور کسی قول کو نقل نہیں کیا ہے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے نزدیک ۱۲۹ھ سال وفات صحیح ہے۔ تو عاصم کی وفات اور ابو عبدالرحمن کی وفات کے درمیان ۵۷ برس کا فاصلہ ہوتا ہے اور امام ذہبی کی کتاب طبقات القراء کا ذیل جو ابو المحاسن محمد بن علی الحسینی نے لکھا ہے اس میں ہے کہ عاصم بن بہدلہ سے اعمش نے قرآت حاصل کی اور عاصم نے اعمش سے حدیث لی اور دونوں میں قرابت قریبہ تھی مگر عاصم اعمش سے چار برس چھوٹے تھے۔ اعمش کے ترجمے میں ان کا سال ولادت ۶۱ھ لکھا ہے اس حساب سے عاصم کا سال ولادت ۶۵ھ ٹھہرتا ہے تو جب ابو عبدالرحمن السلمی کی وفات ۷۲ھ میں ہوئی تھی تو اس وقت عاصم کی عمر صرف سات برس کی ٹھہرتی ہے۔ ممکن ہے کہ عاصم کے والد نے تبرکاً ان سے کچھ قرآن پڑھوا دیا ہو۔ ورنہ یہ عمر فن قرآت واختلافات قرآت سیکھنے کی نہیں ہے۔

زر بن حبیش باقی رہے عاصم کے دوسرے استاد زر بن حبیش۔ ان کی اور ان کے ایک اور ساتھی شقیق بن سلمہ ابو وائل الاسدی دونوں کی عجیب وغریب شخصیت ہے۔ دونوں کی عمروں میں تو باپ بیٹے ہی کا نہیں بلکہ دادا اور پوتے بلکہ پردادا اور پرپوتے کا فرق ہوسکتا ہے۔ مگر دونوں میں اس قدر یک دلی و یکجہتی تھی کہ دونوں ایک سال مرے۔ یعنی ۸۲ھ ہی میں دونوں کی وفات ہوئی۔ یہ دونوں اہل کوفہ کے نزدیک تابعین

میں سے تھے اور حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کے خاص شاگردوں میں ان کا شمار کرتے ہیں۔ ان دونوں سے صرف اہل کوفہ ہی روایت کرتے ہیں کوئی ایک غیر کوفی بھی ان دونوں سے روایت نہیں کرتا۔ خیر ابو وائل سے ہمیں کام نہیں اسلئے زر بن حبیش کا حال سنیئے۔

کوفیوں ہی کی روایت سے علمائے رجال لکھتے ہیں کہ یہ زمانہ جاہلیت کے آدمی تھے ایک سو ستائیس برس کی عمر پائی۔ وفات ۸۲ ھ میں ہوئی۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ بعثت نبوی کے وقت یہ اکیس برس کے تھے۔ مگر یہ کہاں رہتے تھے کہاں پیدا ہوئے کسی کو کچھ معلوم نہیں۔ شقیق بن سلمہ ابو وائل بھی اسدی کہے جاتے ہیں اور زر بن حبیش بھی اور دونوں جاہلی ہونے کا دعویٰ رکھتے تھے۔ یا دونوں کو جاہلی کہا جاتا ہے ابو وائل کے بیان میں بتایا جاتا ہے کہ وہ کہتے تھے کہ میں نے جاہلیت کے چھ برس پائے تھے۔ جہاں تک غور کیجئے صاف پتا ملتا ہے کہ کوفے کے اسدیوں نے یہ دو نام گھڑ لئے تھے اور ان کو حضرت علی اور حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کا خاص شاگرد قرار دے کر ان سے روایتیں منسوب کر کے پھیلائیں اسی لئے صرف کوفیوں ہی کو ان کے تلامذہ قرار دیا۔ کسی غیر کوفی کو ان کا شاگرد بتاتے تو راز کھل جاتا کوفے میں بعض ثقہ محدثین بھی تھے۔ مثلاً عامر بن شرجیل الشعبی الکوفی، ابراہیم النخعی الکوفی، سعید بن مسروق الثوری الکوفی وغیرہ ان لوگوں کے واسطے سے بھی ان کے بعد والے کوفیوں نے زر بن حبیش اور ابو وائل سے حدیثیں روایت کی ہیں یا بصرہ و مصر و شام وغیرہ کے منافقین نے۔ اس لئے زر بن حبیش اور ابو وائل سے روایت کرنے

والوں میں کوفہ کے بعض ثقہ محدثین کے نام دیکھ کر دھوکا نہیں کھانا چاہئیے ان ثقہ راویوں کے بعد جن کے نام آتے ہیں ان کا حال دیکھنے سے حقیقت واضح ہوجائے گی انشاء اللہ تعالیٰ۔

مختصر یہ ہے کہ زر بن حبیش وشقیق بن سلمہ ابو وائل دو فرضی شخصیتیں تھیں جن سے صرف کوفہ ہی والے منسوب کر کرکے حدیث روایت کیا کرتے تھے۔ لیکن جب ان کے اصل شاگرد امام القراءت حفص بن سلمان ہی قابل وثوق نہ ہوں تو پھر ان کے اوپر کے ناموں کی وثاقت ان کی روایات کی توثیق کی کیا ذمہ دار ہوسکتی ہے۔

عاصم کے دوسرے شاگرد حفص بن سلیمان القاری

حفص بن سلیمان الاسدی ابو عمیر البزار الکوفی القاری۔ ان کو غاضری بھی کہتے ہیں یعنی غاضر بن الملک بن ثعلبہ کی طرف بھی منسوب کئے جاتے ہیں۔ اور ان کو حفیص (بصیغہ تصغیر) بھی کہتے ہیں۔ یہ عاصم بن ابی النجود (جن کو عاصم بن بہدلہ بھی کہتے ہیں) کے ربیب یعنی ان کی بیوی کے پچھلے شوہر کے بیٹے تھے۔ اس لئے عاصم بن بہدلہ الکوفی کی گود میں پلے اور انہیں سے قرآت بھی سیکھی اور ان سے حدیثیں بھی روایت کرتے تھے۔ امام احمد بن حنبل اور ابو حاتم نے ان کو متروک الحدیث قرار دیا ہے اور یحییٰ بن معین نے غیر ثقہ کہا۔ علی بن المدنی نے بھی ان کو ضعیف الحدیث کہا اور ان کو ترک کیا۔ امام بخاری، امام مسلم دونوں نے ان کو متروک الحدیث لکھا۔ صالح بن محمد نے کہا کہ ان کی حدیث نہ لکھی جائے۔ واحادیث کلھا مناکید۔ ان کی ساری حدیثیں مستحق

الکار ہیں۔ (میں منکر کا ترجمہ لوگوں کے سمجھانے کو ہی کرتا ہوں) ساجی نے کہا کہ سماک وغیرہ سے باطل حدیثیں روایت کیا کرتے ہیں۔ ابن خراش نے کہا کہ کذاب متروک یضع الحدیث۔ یعنی بڑا جھوٹا ہے مستحق ترک ہے حدیث گھڑتا ہے۔ ابو احمد حاکم نے کہا کہ یہ گئی گزری حدیث والے ہیں۔ امام شعبہ نے یحییٰ بن سعید سے کہا کہ مجھ سے ایک کتاب مستعار مانگ کر لے گیا مگر واپس نہیں لایا۔ دوسروں کی کتابیں لے کر ان سے حدیثیں نقل کرلیا کرتا تھا۔ احمد بن محمد الحدادوی یحییٰ بن معین سے روایت کرتے ہیں کہ (عاصم بن ابی النجود کے شاگردوں میں) حفص اور ابوبکر، عاصم کی قرآت کے سب سے زیادہ جاننے والے ہیں۔ اور حفص ابوبکر سے زیادہ قرآت جاننے والا تھا۔ اور یہ کذاب تھا۔ ابن حبان نے کہا کہ یہ حدیثوں کے اسناد میں الٹ پلٹ کردیا کرتا تھا اور مرسل کو مرفوع بنا دیتا تھا۔ ابن جوزی نے موضوعات میں لکھا ہے کہ عبدالرحمن بن مہدی نے کہا کہ و اللہ لا تحل الروایۃ عنہ (قسم اللہ کی ان کی حدیث کا روایت کرنا جائز نہیں ہے) امام بخاری نے تاریخ اوسط میں ۱۸۰ھ اور ۱۹۰ھ کے درمیان ان کی وفات لکھی ہے (تہذیب التہذیب جلد ۲، صفحہ ۴۰۰) مگر مراۃ الجنان میں لکھا ہے کہ ۱۸۰ھ میں نوے برس کی عمر پاکر وفات پائی جلد ۱، صفحہ ۳۷۸۔ مگر سوچئے تو جس کا برتاؤ حدیث رسول کے ساتھ اچھا نہ ہو تو قرآن مجید کے ساتھ اس کا برتاؤ کیا اچھا رہ سکتا ہے۔ فاعتبروا یا اولی الابصار۔

حفص کے تلامذہ ان کے ایک شاگرد کا نام عبیداللہ بن الصباح لکھا ہے مگر دراصل وہ عبید بن الصباح ہیں عبیداللہ بن الصباح کوئی شخص بھی

دنیائے رجال میں نہیں تھے۔ عبید بن الصباح الکوفی ایک صاحب ضرور تھے اور حفص بن سلیمان کے زمانے ہی میں تھے۔ اور کوفے ہی کے رہنے والے تھے حفص بن سلیمان کے ہمعصروں سے حدیثیں بھی روایت کرتے تھے۔ عیسیٰ بن المہمان البصری ثم الکوفی ابو العلاء کامل بن العلا الکوفی وغیرہ سے یعنی کوفیوں ہی سے روایت کرتے تھے اور ان سے بھی فقط اہل کوفہ ہی روایت کرتے تھے۔ علمائے رجال کے نزدیک غیر معلوم الحال محض معمولی سے راوی تھے مگر نہ ان کو قاری لکھا ہے نہ حفص بن سلیمان سے ان کا کوئی تعلق لکھا ہے نہ حفص کے تلامذہ میں ابن حجر یا ذہبی وغیرہا نے عبید بن الصباح، عبیداللہ ابن الصباح کا نام لکھا ہے مگر فن قرآت والے تو گمناموں ہی کو کھینچ کھینچ کر اپنے یہاں لے آتے ہیں۔

حفص کے دوسرے شاگرد جو بیان کئے جاتے ہیں عمرو بن الصباح ان کا بھی کتب رجال میں کہیں نام ونشان نہیں۔ عبیداللہ بھی " ابن الصباح اور عمرو بھی " ابن الصباح " اس لئے معلوم ہوتا ہے کہ اگر یہ دونوں اسمائے بے مسمیٰ نہیں ہیں بلکہ دو شخصیتیں ہیں تو غالباً دونوں ایک ہی باپ کے بیٹے ہوں اور اگر ہونگے تو پھر یہ دونوں بھی کوفے ہی کے ہونگے اور کسی کے آزاد کردہ غلام ہی ہونگے۔ یہ خود نہیں تو ان دونوں کے باپ صباح ہی سہی۔

(۶) حمزہ بن حبیب بن عمارۃ الزیات ابو عمارہ التیمی الکوفی

یہ بنی تمیم میں سے کسی کے آزاد کردہ غلام تھے عبدالرحمن بن مہدی جو بہت مشہور امام المحدثین تھے امام بخاری وغیرہ کے شیوخ میں تھے۔ وہ فرماتے تھے کہ اگر مجھ کو سیاسی اقتدار حاصل ہوتا تو جس کو حمزہ کی قرآت سے قرآن پڑھتے سنتا اس کی پیٹھ اور پیٹ کو (مارتے مارتے) درد سے بھر دیتا۔ کوفے اور حلوان کے درمیان لے جاکر تیل بیچا کرتے تھے۔ ابن حجر ان کے زہد وورع وعبادت وتقویٰ کی تعریف بھی لکھتے ہیں پھر لکھتے ہیں وقد ذمه جاعة من اهل الحديث فى القراءة و ابطل بعضهم الصلوة باختياره من القراءة یعنی اہل حدیث کی ایک بڑی جماعت نے قرآت کے متعلق ان کی مذمت کی ہے اور بعضوں نے تو ان کی قرآت سے نماز میں قرآن پڑھنے سے نماز کے باطل ہوجانے کا فتویٰ دیا ہے علامہ ساجی اور ازدی نے بھی ان کی قرآت کی مذمت کی ہے۔ حدیث میں بھی یہ کوئی پایہ نہیں رکھتے تھے۔ امام احمد بن حنبل بھی عبدالرحمان بن مہدی وغیرہ کی طرح ایسے امام کے پیچھے نماز کو مکروہ سمجھتے تھے جو حمزہ کی قرآت سے قرآن پڑھے۔ ابو بکر بن عیاش کہتے ہیں کہ حمزہ کی قرآت بدعت ہے۔ ابن درید نے کہا کہ میراجی چاہتا ہے کہ حمزہ کی قرآت کو کوفے سے نکال باہر کردوں مگر یہ تو متقدمین کی رائیں تھیں ۔ قرآت حمزہ کے متعلق متاخرین نے کیا فیصلہ کیا؟ یہ بھی سن لیجئے۔ ابن حجر مذکورہ بالا باتیں لکھنے کے بعد کہتے ہیں کہ قد انعقد الاجماع باخرة على تلقى قراءة حمزه بالقبول - و يكفى حمزة شهادة الثورى له فانه قال ما قرء حمزة حرفا الا باثر - یعنی آخر میں لوگوں کا اجماع حمزہ کی قرآت کو

قبول کرلینے کا ہوگیا۔ اور حمزہ کے لئے سفیان ثوری کی (تنہا) یہ شہادت کافی ہے کہ انہوں نے فرمایا کہ حمزہ نے ایک حرف بھی ایسا نہیں پڑھا جو کسی نہ کسی اثر (یعنی کسی صحابی کے قول سے یا تقریر سے اور تقریر کا مطلب یہ ہے کہ کسی صحابی نے حمزہ والی مخصوص قرآت کو سنا اور خموش رہے) سے ثابت نہ ہو۔

مگر حمزہ کی ولادت ۸۰ ھ کی تو خود ابن حجر ہی لکھ رہے ہیں۔ بظاہر انہوں نے تو کسی صحابی کی صورت بھی نہیں دیکھی ہوگی۔ ان کے اساتذہ بلا استثناء سب کے سب کوفی، ان میں بھی زیادہ تر آزاد کردہ غلام اور زیادہ تر شیعے اور سفیان ثوری جو تنہا ان کے لئے صفائی کے گواہ بنے وہ بھی کوفی ہی تھے۔ مگر ان کے مذہب میں ضعفاء و مجروحین کی روایتیں بھی مقبول تھیں۔ اس لئے یہ کیوں دیکھتے کہ زیات یعنی حمزہ صاحب اپنی قرآت کے جو آثار پیش کرتے ہیں وہ کس قسم کے راویوں سے مروی ہیں۔ اور پھر معلوم نہیں واقعی سفیان ثوری نے ایسا کہا بھی تھا یا نہیں؟ سفیان ثوری کی وفات ۱۶۱ھ میں ہوئی تھی اور ابن حجر متوفے ۸۰۲ ھ کی پیدائش اٹھویں صدی میں ہے۔ اس لئے سفیان ثوری تک اپنا سلسلہ اسناد ان کو لکھنا تھا۔ اور شاید سفیان ثوری کو بھی ابن حجر نے ذوالشہادتین سمجھ لیا کہ پوری جماعت محدثین کے خلاف صرف ایک شخص کی شہادت ایک مجرم کی حمایت میں کافی سمجھ لی۔ خود سفیان ثوری کی ولادت ۹۷ھ میں ہوئی تھی کسی صحابی کی پرچھائیں تک انہوں نے نہیں دیکھی تھی۔ باقی رہے تابعین تو تابعین ہی میں قاتلین حضرت عثمانؓ اور قاتلین حضرت حسینؓ بھی تھے۔ وہ سب بھی تو آخر تابعی ہی تھے۔ منافقین

تو آآکر تابعی ہی بنتے گئے تھے۔ اس لئے آنکھ بند کر کے تابعی ثقہ کہنے میں تو صحاح تک میں مکذوبات کا ایک معقول ذخیرہ رکھوا دیا۔ غرض سفیان ثوری کی وفات ۱۶۱ھ میں ہے۔ متاخرین تک ثوری کی یہ صفائی کی گواہی کن راویوں کے ذریعے پہنچی۔

سلیم بن عیسیٰ پھر حمزہ صاحب کو صرف ایک ہی شاگرد رشید ملے سلیم بن عیسیٰ الحنفی - بنی حنیفہ میں سے کسی کے آزاد کردہ غلام تھے، ان کی بدنامی کی وجہ سے کوئی اور ان کا شاگرد نہ ہوا۔ انہیں جیسا ایک آزاد کردہ غلام کسی طرح ان کو مل گیا۔

ان سلیم صاحب کے البتہ دو شاگرد ہوگئے خلاد بن خالد الشیبانی ابو عیسیٰ متوفی ۲۲۰ھ یہ حمزہ کے بھی خاص شاگرد تھے اور حمزہ کی قرآت کو آگے بڑھانے والے دراصل یہی تھے دوسرے خلف بن ہاشم جو طالب بن غراب البزاری کے نام سے بھی متعارف ہیں۔ انہوں نے حمزہ کی قرآت پر قناعت نہ کی دوسرے قاریوں کی قرات بھی سیکھی صرف حمزہ ہی کے ہو رہنا انہوں نے گوارہ نہ کیا۔

علی بن حمزہ بن عبداللہ بن قیس بن فیروز
الاسدی مولاهم الکوفی المعروف بالکسائی

یہ بھی اسدیوں میں سے کسی کے آزاد کردہ غلام تھے عجمی تھے۔ ان کے والد اور ان کے دادا ساتھ ساتھ مشرف بہ اسلام ہوئے تھے۔ یہ بھی ان کے ساتھ کمسنی ہی میں مشرف بہ اسلام ہوئے اور کوفے میں علوم دینیہ حاصل کرنے لگے۔ عربی زبان میں علم نحو میں بڑی مہارت پیدا کی اور علم

نحو میں کتاب بھی تصنیف کی۔ کوفے سے بغداد چلے گئے تھے ہارون رشید نے ان کو اپنے درباریوں کی تعلیم سپرد کردی۔ خلیفہ وقت امیرالمومنین کے صاحبزادوں کے استاد تھے اس لئے عوام پر ان کا ایک خاص اثر تھا اور عزت واحترام سے دیکھے جاتے تھے۔

کسائی نے قرآت حمزہ الزیات سے سیکھی اور چار باران سے قرآن پڑھا اور محمد بن عبدالرحمن بن ابی لیلیٰ متوفی ۱۴۸ھ سے بھی قرآت سیکھی اور قرآن پڑھا حمزہ زیات سے تو آپ واقف ہوچکے محمد بن ابی لیلیٰ کوفی تھے اور کوفے کے قاضی بھی تھے اور فقہا میں شمار ہوتے تھے۔ بدحافظہ ہونے میں اپنی مثال آپ تھے۔ امام شعبہ نے کہا کہ ان سے زیادہ بدحافظہ میں نے کسی کو دیکھا ہی نہیں۔ سارے محدثین شیعہ سنی سب کا ان کے بدحافظہ ہونے پر اجماع ہے۔ مگر اہل سنت کے یاں یہ بدحافظہ ہونے کے سبب سے سند وحجت نہیں سمجھے جاتے۔ البتہ شیعوں کے یہاں ان کے بدحافظہ ہونے کے اعتراف کے باوجود ان کو سند وحجت سمجھا جاتا ہے غرض یہ شیعوں میں شیعے تھے۔ اور سنیوں میں سنی تھے۔ پھر آخر کوفی ہی تو تھے۔

اور کسائی کے تیسرے استاد عیسیٰ بن عمرالاسدی الہمدانی الکوفی متوفی ۱۵۶ھ تھے۔ جو اسدیوں میں سے کسی کے آزاد کردہ غلام تھے۔ قرآت میں عاصم بن ابی النجود کے شاگرد تھے اور سلیمان الاعمش کے بھی شاگرد تھے۔ عاصم بن ابی النجود۔ اعمش اور یہ عیسیٰ بن عمر اور خود کسائی چاروں اسدیوں کے آزاد کردہ غلام تھے اور چاروں کوفی تھے۔

اور کسائی کے چوتھے استاد ابوبکر بن عیاش الاسدی الکوفی جو ۹۶ھ میں

پیدا ہوئے تھے اور ۱۹۲ھ میں وفات پائی یہ بھی ایک اسدی واصل الاحدب کے آزاد کردہ غلام تھے اور کوفی تھے ۔ قال ابو نعیم لم یکن فی شیو خنا اکثر غلطا منه ابو نعیم کہتے ہیں کہ ہم لوگوں کے استادوں میں ان سے زیادہ غلطی کرنے والا کوئی نہ تھا ۔ روایت میں بہت غلطی کرتے تھے ۔ عاصم بن ابی النجود کے شاگرد رشید تھے ۔

اور کسائی کے پانچویں استاد سلیمان الاعمش الاسدی الکوفی تھے جو اسدیوں کے آزاد کردہ غلام تھے ۔ حضرت حسینؓ بن علیؓ کی شہادت کے دن یعنی یوم عاشورہ ۶۱ھ میں پیدا ہوئے اور ۱۴۸ھ میں وفات پائی شیعہ تھے ۔ مگر متقدمین شیعوں میں سے تھے جب شیعہ مذہب میں سارے صحابہ سے بغض و عناد پیدا نہ ہوا تھا ۔ اور نہ سنی و شیعہ کے درمیان مذہبی بٹوارہ ہوا تھا ۔ کوفے میں اسدیوں اور ہمدانیوں کے دو محلے ہی خاص شیعوں کے محلے تھے جن میں غالب اکثریت شیعوں ہی کی تھی جمع احادیث میں دونوں مذہب کے علماء مل جل کر کام کررہے تھے ۔ شیعوں نے بڑی ہوشیاری یہ کی کہ جمع احادیث کا کام تو اہل سنت ہی پر چھوڑ دیا مگر حدیثیں لا لا کر بذریعہ رواۃ جامعین تک پہنچانا اپنے ذمے رکھا ۔ اسی لئے جامعین احادیث متقدمین آپ اہل سنت ہی کو پائنگے مگر راویوں میں باوجود قلت تعداد کے شیعوں کو اہل سنت کے برابر تعداد میں پائینگے اور پھر ان کے مذہب میں تقیہ کتمان واجبات دین میں سے ہے اس لئے کتنے شیعے سنیوں کے لبادے اوڑھ کر حدیثیں روایت کیا کرتے تھے اور وہ سنی سمجھے جاتے تھے ۔ جن کا تشیع معلوم ہوجاتا تھا ان کے بھی ظاہری زہد وورع کا خیال کرکے اہل سنت جامعین حدیث ان کی روایتیں قبول

کرلیتے تھے۔ ابو اسحاق السبیعی کے ترجمے میں ابن حجر تہذیب التہذیب جلد ۸، صفحہ ۶۶ میں لکھتے ہیں قال ابو اسحاق الجوزجانی کان قوم من اهل الکوفة لا تحمد مذاهبهم یعنی التشیع وهم رؤس محدثی الکوفة مثل ابی اسحاق والاعمش ومنصور وزبید وغیرهم من اقرانهم احتملهم الناس علی صدق السنتهم فی الحدیث ووقفوا عند ما ارسلوا لما خافوا ان لا یکون مخارجها صحیحة اما ابو اسحاق فروی عن قوم لا یعرفون ولم نتسه عنهم عند اهل العلم الا ما حکی ابو اسحاق عنهم فاذا رویٰ تلک الا شیاء عنهم کان التوقیف فی دلک عندی الصواب "
یعنی ابو اسحاق جوزجانی نے فرمایا کہ اہل کوفہ میں ایک جماعت تھی جن کا مذہب یعنی تشیع ناپسندیدہ سمجھا جاتا تھا جیسے ابو اسحاق السبیعی، سلیمان الاعمش، منصور بن معتمر اور زبید الیامی وغیرہ ان کی برادری کے لوگ۔ کہ لوگوں نے ان کی زبانی صداقت پر اعتماد کرکے ان کی حدیثیں برداشت کرلیں اور جہاں مرسل حدیثیں روایت کرنے لگے تو رک گئے۔ اس خوف سے کہ کہیں ان مرسل حدیثوں کا سرچشمہ غلط نہ ہو۔ مگر ابو اسحاق السبیعی تو ایسے لوگوں سے روایت کرتے ہیں جن کو اہل علم کچھ نہیں جانتے۔ جن کی حدیثیں لوگوں میں نہیں پھیلیں بجز اتنے بھر کے جتنی حدیثیں ان سے بھی ابو اسحاق روایت کرتے ہیں۔ تو جب ایسے لوگوں سے یہ روایت کریں تو میرے نزدیک ایسی حدیثوں سے رکے رہنا بہتر ہے۔"

امام ذہبی نے بھی میزان الاعتدال جلد ۱، صفحہ ۳۴۵ میں زبید بن الحارث الیامی کے ترجمے میں اس قول کو نقل کیا ہے۔ چنانچہ مالک بن

اغزر مالک بن مالک ہیثم بن حسن ، یزید بن زید اور زید بن بقیع وغیرہم سے ابو اسحاق السبیعی کے سوا دنیا کا کوئی محدث روایت نہیں کرتا۔ اور نہ کوئی ان لوگوں سے کچھ واقف ہے کہ یہ لوگ کون تھے، بجزاس کے کہ ابو اسحاق السبیعی کے شیوخ خصوصی یا مصنوعی تھے اور امام ذہبی نے میزان الاعتدال جلد ۱، صفحہ ۴۲۳ میں لکھا ہے قال ابن المبارک انما افسد حدیث اهل الكوفة ابن اسحاق و اعمشکم هذا- اہل کوفہ کی حدیثوں کو غارت کردیا ابو اسحاق اور تمہارے اس اعمش نے ۔ بالکل اسی طرح کا قول معن بن عیسیٰ کا بھی اور متعدد محدثین کا منقول ہے ۔ مگر ان تمام باتوں کے باوجود اہل سنت رواداری سے کام لیتے رہے اور ان کی روایت کردہ حدیثوں کو اپنی کتابوں میں درج کرتے رہے۔ چنانچہ صحاح ستہ کی کون سی کتاب ہے جس میں ان لوگوں کی خاص کرکے ابو اسحاق اور اعمش کی حدیثیں نہیں ہیں۔

کچھ دنوں کے بعد بعض شیعوں نے بھی جمع حدیث کا کام شروع کیا وہ اہل سنت کی حدیثیں بھی اپنی کتاب میں درج کرنے پر مجبور تھے۔ جس طرح ابو عبداللہ الحاکم صاحب مستدرک نے مستدرک میں فضائل خلفائے راشدین وفضائل حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہم اجمعین کی حدیثیں بھی درج کرلی ہیں۔ لیکن شیعے اس مشترک دین پر زیادہ دنوں تک قناعت نہ کرسکے اور سب سے پہلے ابو جعفر کلینی نے خالص شیعہ نقطہ نظر کی حدیثیں خاص شیعہ راویوں سے اہل سنت سے بالکل الگ ہوکر جمع کر ڈالیں جن کی کتاب اصول کافی اور فروع کافی کئی جلدوں میں ان کے خاص مذہب کی کتابیں ہیں۔ پھر ان کے دوسرے محدثین بھی اپنے خاص

مذہب کی حدیثیں اہل سنت سے قطع تعلق کر کے جمع کرنے لگے مگر جب تک جمع احادیث کا سلسلہ قائم رہا شیعے اہل سنت کے ساتھ بھی برابر کے شریک رہے اور اپنا الگ کام بھی کرتے رہے۔ اس لئے حدیث کی کوئی کتاب بھی خاص اہل سنت کی دنیا میں نہیں ہے جس طرح خاص شیعہ مذہب کی حدیث کی چار کتابیں صحاح اربعہ مشہور ہیں۔ کافی، تہذیب استبصار اور من الایحضرہ الفقیہ۔ کہ یہ چاروں کتابیں خاص شیعہ مذہب کی ہیں جن میں اہل سنت کا کوئی حصہ نہیں ہے۔ مگر جتنی کتابیں اہل سنت کی کہی جاتی ہیں۔ موطا اور بخاری مسلم تک ہر کتاب میں شیعے برابر کے شریک ہیں اور ہر کتاب میں ان کا حصہ رسدی موجود ہے۔ فرق اس قدر ہے کہ وہ اپنی کتابوں میں جو کچھ کہتے ہیں کھل کر کہتے ہیں اور مشترک کتابوں میں جو کچھ اپنی سی کہتے ہیں۔ دبی زبان سے کہتے ہیں۔ گول مول الفاظ میں مفہوم ادا کرتے ہیں۔ کہنا مقصود کچھ اور ہے اور کہتے ہیں کچھ اور۔

مختصر یہ ہے کہ دنیا میں حدیثوں کی کوئی کتاب ایسی نہیں ہے جو خاص اہل سنت کے حدیثوں کا مجموعہ کہی جا سکے۔ ہر کتاب میں شیعوں کا حصہ رسدی موجود ہے۔ اس لئے کسی کتاب حتیٰ کہ بخاری و مسلم کو بھی خاص اہل سنت کی کتاب سمجھنا سخت غلطی بلکہ ظلم ہے۔ شیعہ ہی نہیں بلکہ خارجی معتزلہ قدریہ وجبریہ وجہمیہ ہر مذہب کی حدیثیں ان میں موجود ہیں۔ مگر شیعوں کے سوا کسی مذہب نے بٹوارہ کر کے اہل سنت سے علیحدگی نہیں اختیار کی نہ کسی اور مذہب والوں نے اپنی حدیثیں اہل سنت سے الگ ہو کر جمع کیں جبکہ شیعوں نے علیحدگی اور مکمل علیحدگی اختیار کی۔

بس اس کا فرق ہے اختلافات قرآت کی روایات میں آپ شیعے راویان کو بہت دیکھینگے ۔ "انزل القرآن علی سبعۃ احرف" والی وضعی حدیث کوفے ہی میں بنی اور یہیں سے شائع ہوئی۔ شیعے ہی اس کے ابتدائی راوی ہیں اور درمیان میں بھی شیعے راوی ملینگے۔ مگر بٹوارے کے بعد انہوں نے اس سے خود انکار کردیا۔ چنانچہ اصول کافی میں ان کا انکار موجود ہے کہ انزل من واحد علی حرف واحد۔ خدائے واحد کی طرف سے قرآن اترا ہے اور ایک ہی حرف ایک ہی قرآت پر اترا ہے اور یہی صحیح ہے ۔ منافقین جو شیعوں میں گھلے ملے تھے وہ تو تیسری صدی تک ختم ہوگئے تھے ۔ تھوڑے بہت ان کے ذریات رہ گئے تھے چوتھی پانچویں صدی میں تو اسلام سے نفاق کا وہ زور باقی نہیں رہا تھا۔ البتہ صحابہ اور امہات المومنین رضی اللہ عنہم اجمعین کے ساتھ بغض وعناد بڑھتا گیا۔ مگر نفس اسلام اور قرآن ورسول سے وہ بغض وعناد جو منافقین کو تھا عام شیعوں میں نہ رہا۔

حاصل بحث یہ ہے کہ اب اختلافات قرآت کے بانی قراء شیعہ اور ان کے تلامذہ کی فہرست کو دیکھ جائیں۔ اسّی فیصد سے زیادہ آپ ان میں منافقین ہی کو پائینگے۔ اور اسّی فیصد سے زیادہ غلاموں ہی کو پائینگے۔ اور عجمی الاصل ہی آپ کو ملینگے۔ اگر کوئی نظر بھی آئے گا تو وہ حجاز کا رہنے والا ہوگا قریشی تو کبھی نہیں ہوگا کسی دور دراز خطہ عرب کا ہوگا۔

آپ دیکھیے جو قرآن ساری دنیا میں ہر مسلم کے گھر میں موجود ہے عہد نبوی سے آج تک یکساں بغیر کسی اختلاف کے چلا آرہا ہے ۔ اس کو مشکوک ومشتبہ قرار دے کر مسلمانوں سے چھوڑوانے کی اور اس کی جگہ

اپنے خود ساختہ قرآن کو رواج دینے کی کیسی کیسی زبردست کوشش کی گئی۔ اگر اللہ کی حفاظت قرآن مجید کے شامل حال نہ ہوتی تو قرآن کب کا مسلمانوں سے چھن گیا ہوتا۔

(۱) یہ قرآن وہ ہے جس کو حضرت عمرؓ کے مشورے سے حضرت ابو بکرؓ نے حضرت زید بن ثابتؓ سے پہلے ایک مسودے کی صورت میں جمع کرایا تھا جو سترہ برس تک بے مصرف رکھا رہا۔

(۲) ۳۰ھ میں حضرت عثمانؓ نے اس کو چند لوگوں سے مرتب ومدون کرا کے اور اس کی نقلیں کرا کے تمام ممالک میں بھیجیں کہ ہر شخص اپنے مصاحف کو اسی کے مطابق بنالے اور مصاحف میں اختلاف باقی نہ رکھے۔

(۳) چار پانچ انصاری صحابہؓ نے بہ عہد نبوی ہی پورا قرآن جمع کر رکھا تھا۔ عبداللہ بن مسعودؓ، ابو درداء، ابی بن کعب زید بن ثابت اور معاذ بن جبل۔

(۴) حضرت عثمانؓ نے جو تمام اقطار وامصار اور اپنا مرتب کرایا ہوا مصحف بھیجا تو ہر جگہ کے لوگوں نے تو خلیفہ وقت کے حکم کے مطابق اپنے اپنے مصحف کو مصحف عثمانؓ کے مطابق بنالیا مگر اہل کوفہ کو حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے منع کیا کہ تم لوگ اپنے اپنے مصحف کو علی حالہ رہنے دو۔ مصحف عثمانی کے مطابق نہ بناؤ اور اہل کوفہ کے پاس عبداللہ بن مسعودؓ کا مصحف رائج تھا۔ مغیرہ کے پاس ابی بن کعب کا مصحف تھا بعض کے پاس ابو درداء کا بعض کے پاس معاذ بن جبل کا۔ چونکہ سب مصاحف عہد نبوی کے جمع کردہ تھے تو یقیناً مرضی نبوی کے مطابق ہی جمع کئے گئے تھے۔ اس لئے حضرت عثمانؓ کے ترتیب دادہ

مصحف سے زیادہ قابل اعتبار یہ سب مصاحف ٹھہرئے اور یہ سارے مصاحف اب صرف کوفہ ہی میں رہ گئے۔ دوسری جگہ کے لوگوں نے تو اپنے اپنے مصاحف کو مصحف عثمانی کے مطابق بنالیا۔ اس لئے اہل کوفہ جو اختلافات مصحف عثمانی سے رکھتے ہیں ان کے اختلافات ان مصاحف کے بارے میں ہیں جو عہد نبوی میں تعلیم نبوی و پسند نبوی کے مطابق جمع کئے گئے تھے اس لئے اہل کوفہ کی ہر قرآت مصحف عثمانی کی قرآت سے زیادہ مستند اور واجب الاتباع ہونا چاہئیے۔

(۵) انزل القرآن علی سبعۃ احرف کے مطابق ہر قرآت صحیح ہے مصحف عثمانی بھی غلط نہیں ہے مگر عہد نبوی کے جمع شدہ کے مقابل عہد عثمانی کے جمع شدہ کی کیا اہمیت ہو سکتی ہے۔

(۶) نقطہ واعراب کا وجود ہی پہلے نہ تھا اس لئے نقطہ و اعراب کا فرق بھی جو اہل کوفہ بیان کریں وہ بعہد نبوی جمع کردہ مصاحف کے مطابق ہے اس لئے مصحف عثمانی سے زیادہ معتبر ہے۔

(۷) مصحف عثمانی حفص کی قرآت کے مطابق ہے اور حفص کی قرآت کوفے کی قرآتوں میں سے ایک کمزور شاخ ہے۔ نہ یہ قاری اہل مدینہ نافع کی قراءت کے مطابق ہے اور نہ قاری اہل مکہ ابن کثیر کی قراءت کے مطابق ہے۔ اور نہ بصرہ کے ایک آزاد عرب کی قرآت کے مطابق ہے تو کوفے کے ایک آزاد کردہ غلام عاصم بن بہدلہ کے پروردہ جس پر محدثین کذب و افتراء علی الرسول کا الزام عائد کرتے ہیں اسکی قرآت کے مطابق ہے۔ اس لئے رائج قرآتوں کو چھوڑ کر خواہ مخواہ مرجوع قرآت کیوں اختیار کی جائے؟

ان وجوہ کی بناء پر مسلمانوں کو مصحف عثمانی کو چھوڑ کر مصحف عبداللہ بن مسعودؓ کی قرآت کو اختیار کرنا چاہئیے اور ہر شخص کو لازم ہے کہ روایات کے مطابق سورہ فاتحہ اور معوذتین یعنی آخری دونوں سورہ فلق اور ناس قرآن سے نکال باہر کریں کیونکہ عبداللہ بن مسعودؓ کے قرآن میں یہ تینوں سور قرآن نہ تھے۔ اور فلاں آیت کو یوں بتلائیے اور فلاں کو یوں۔ ورنہ وہ عہد نبوی کے جمع کردہ آپ کے تعلیم و پسند کے مطابق جمع کردہ قرآن پر حضرت عثمانؓ کے مرتب کئے ہوئے قرآن پر ترجیح دینے کا گنہگار ہو گا۔

اور پھر فلاں فلاں آیات کو بکری کھا گئی۔ اور فلاں آیت فلاں صحابی کے جنگ یمامہ میں شہید ہو جانے کے باعث انہیں کے ساتھ وہ بھی شہید ہوگئی۔ چونکہ صرف انہیں کو یاد تھی وہ سورہ احزاب سورہ بقرہ کے برابر اتری تھی مگر جس قدر ملا لوگوں نے لکھ لیا۔ اس قسم کی روایت شیہاتیہ ومکذوبات ابلیسیہ کو بھی اختلافات قرات کی بحث کے ساتھ ملا لیجئے تو پھر دیکھئے ایمان بالقرآن المجید کی کیا ہئیت کذائی باقی رہتی ہے۔

نقطوں کے وجود کے متعلق ایک اعتراض اور اس کا جواب

اختلافات قرآت کے متعلق میرے مضمون کے مطالعہ کے بعد دو مخلص عزیزوں نے کچھ شبہات لکھ کر بھیجے ہیں۔

پہلے عزیز لکھتے ہیں:۔

"زمانہ نبوی اور دور صحابہؓ کے متعدد مخطوطات دریافت اور دستیاب ہوچکے ہیں۔ جو تاریخی تواتر کی حیثیت سے اس علم

الیقین کے حامل ہیں کہ وہ ان ادوار کے اصل مخطوطات ہیں۔ مثلاً (۱) مکتوب نبوی بنام نجاشی (۲) مکتوب نبوی بنام منذر بن سامری (۳) مکتوب نبوی بنام مقوقس (مصر)۔ (۴) مکتوب نبوی بنام اہل خیبر۔ (۵) مکتوب حضرت عمرؓ۔ (۶) مدینہ منورہ کے ایک پہاڑ پر وہ کندہ تحریر جن میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم، حضرت ابوبکر صدیقؓ، حضرت عمرؓ اور حضرت علیؓ کے اسمائے گرامی ہیں۔ وغیرہ وغیرہ۔ پھر ابھی حال میں ہمام بن منبہ کا جو مجموعہ حدیث دریافت ہوا ہے۔ ان کے علاوہ انہیں ادوار کے متعدد مختلف اشخاص و رجال اور قبیلہ وحکومت کے قلمی دستاویزات اور یہ سارے مخطوطات دنیا کے مختلف میوزیم اور لائبریریوں میں محفوظ ہیں اور ان میں سے بہتیرے مختلف مخطوطات کے فوٹو لے کر بطور نمونہ شائع ہوئے ہیں۔ ان میں سے کسی میں بھی نقطے والے حروف پر نقطے موجود نہیں۔

اس کے بعد جو کچھ لکھا ہے اس کا خلاصہ طوالت تحریر سے بچنے کے لئے حسب ذیل ہے۔

(۱) یا تو سب کو جعلی کہا جائے تو اس کو کوئی صاحب عقل سلیم ہرگز تسلیم نہیں کرے گا۔

(۲) سب تحریریں بغیر نقطوں کے لکھی جاتی تھیں۔ مگر قرآن باضابطہ نقطوں کے ساتھ لکھا جاتا تھا۔ تو اس دعوے کے لئے ٹھوس اور وزنی دلیل درکار ہے۔ محض اعتقادی جذبات سے اپیل یا اشعار جاہلیت کی روشنی میں محض یقیناً ایسا ہی ہوا ہوگا) کہہ دینے سے تحقیق کا حق ادا نہ

ہوگا۔ جس زمانے میں تحریر وخط کا جو رواج اور طرز ہوگا اسی کے مطابق ساری چیزیں مکتوب ہوں گی۔ چاہے وہ معمولی اور عام مراسلے ہوں یا کوئی اہم دستاویز۔ الخ۔"

میرے دوسرے عزیز مخلص نے یوں لکھا ہے۔

(۱) ابن جنی کے نقل کردہ اشعار اور ابن ندیم کی روایت ایسی دلچسپ خبریں ہیں کہ ہر پڑھنے والا پھڑک اٹھے گا میرے سامنے پہلی بار یہ تحقیق آئی ہے جو دل کو لگتی ہے۔ البتہ پہلے شعر کے دوسرے مصرعے میں ایک چیز کھٹکتی ہے۔ و اذا نقطت عین تذرف کالغین میں تذرف کو نقطت کی رعایت سے ماضی ہی ہونا چاہئیے اور جب یہ ماضی ہے تو تذرفت نہ ہونے کی کوئی معقول وجہ ہونی چاہئیے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ یہ لفظ مضارع تذرف ہے (جو دراصل تتذرف تھا) لیکن اس صورت میں وہ بات نہیں ہوتی جو ماضی میں ہے۔

(۲) ان باتوں کے علاوہ فیصلہ کن جو چیز ہو سکتی ہے وہ یہ ہے کہ قرآن مجید کے بعض قدیم ترین نسخے ہنوز دنیا میں موجود ہیں اگر ان کے ایک ایک صفحے کا بھی عکس فوٹو آجائے تو بات صاف ہو سکتی ہے۔

اس کے بعد مصحف عثمانی فلاں جگہ ہے اور مصحف علی فلاں جگہ۔ اس طرح متعدد مصاحف کی نشان دہی کے بعد لکھا ہے کہ "ان سب کو جعلی کہہ دینا یقیناً قابل تسلیم نہ ہوگا تو اگر

ایک ایک صفحے کا فوٹو بھی مہیا ہوجائے تو اس کا پتہ مل جائے گا کہ اس وقت کے مصاحف پر نقطوں کا دستور تھا یا نہیں۔"

الجواب

سب سے پہلے ہم دوسرے عزیز کے ایک اہم شبہے کا جواب دینا ضروری سمجھتے ہیں جو ابن جنیؒ کے پیش کردہ پہلے شعر کے دوسرے مصرعے کے متعلق ہے اس کے بعد پھر دونوں عزیزوں کا یکجائی جواب دیا جائے گا۔ کیونکہ عزیز اول کا شبہ اور عزیز دوم کا دوسرا شبہ ایک ہی ہے۔

اس مصرعہ میں کتابت کی دو غلطیاں ہوگئی ہیں۔ صحیح یوں ہے و اذا نقطت عين تذرف كالغين سر مصرعہ پر واو وزن مصرعہ سے فاضل ازروئے زحاف خزم آیا ہے۔ زحاف خزم سے سر مصرعہ پر ایک سے چار حرفوں تک کا اضافہ ہوسکتا ہے۔ جو تقطیع میں حساب نہیں کیا جاتا اور عموماً اس اضافے کو لکھتے بھی نہیں ہیں۔ قرینے سے سمجھ لیتے ہیں اور اس کے مفہوم کے ساتھ مصرعہ کا مفہوم سمجھتے ہیں۔ یک حرفی اضافہ واو یا فے یا لام کا اگر ہو تو لکھتے بھی ہیں۔ مگر بہت کم۔ ابن جنیؒ کے املی میں واو موجود تھا اس لئے میں نے بھی لکھ دیا۔ مگر اذا کا دوسرا الف کتابت میں کاتب سے حذف ہوگیا۔ جس طرح تذرف کی فے پر جو رفع تھا اس کو انہوں نے فتحہ سے بدل دیا۔ اس تصریح کے بعد تو وہ اعتراض باقی نہ رہا؟ شبہے کا باعث تو اذ تھا کہ یہ ماضی ہی پر آتا ہے اور نقطت ماضی ہے تو شرط کی طرح جزاء کا وقوع بھی زمانہ ماضی ہی میں ہونا چاہئیے۔ اگرچہ یہ کوئی ضروری نہیں ہے۔ مگر مناسب یہی ہے اب جبکہ یہ معلوم ہوگیا کہ یہاں

اذ نہیں ہے بلکہ اذا ہے اور اذا مستقبل ہی پر آتا ہے۔ ماضی پر آتا ہے تو اس کو بھی مستقبل بنا دیتا ہے تو پھر تذرف کا بصیغہ مستقبل جزاء میں آنا ہر طرح صحیح ٹھہرا۔ اور آپ کا شبہ بالکل رفع ہوگیا۔

رمعاف خرم سے اہل ادب تو ضرور واقف ہیں۔ مگر جو لوگ صرف مولوی قسم کے ہیں یقیناً ناواقف ہوں گے۔ وہ سبعہ معلقہ کے پہلے قصیدے کی کوئی شرح دیکھ لیں۔ ورنہ لسان العرب جلد ۱۵، لغت خرم صفحہ ۶۷، ۶۸ دیکھ لیں جس میں مثالیں بھی مذکور ہیں۔

مگر اذ ہی رہے جب بھی شعر صحیح و فصیح ہے ۔ سورۃ آل عمران کے چھٹے رکوع میں ارشاد ہے ۔ ان مثل عیسیٰ عنداللہ کمثل آدم خلقه من تراب ثم قال له کن فیکون مولویانہ نقطہ نظر سے تو فیکون کی جگہ فکان کہنا چاہیئے تھا۔ پھر فیکون کیوں کہا گیا؟ لیکن ایک ادیب سمجھ لے گا کہ یہاں مراد فجعل یکون ہے ۔ اسی طرح یہاں بھی تذرف سے مراد جعلت تذرف ہے ۔ اس لئے یہاں بھی ماضی ہی ہے ۔ مگر اس مثال سے ایک مولوی کی تشفی نہ ہوگی۔ کیونکہ اس آیت میں اذ نہیں ہے۔ ایسی مثال ہونی چاہئیے کہ "اذا" نہیں "اذ" آیا ہو ماضی پر اور اسکے بعد مضارع آیا ہو۔ تو لیجئے سورہ احزاب کی گیارہویں آیت دوسرے رکوع میں پڑھئے۔ اذ زاغت الابصار و بلغت القلوب الحناجر و تظنون باللہ الظنو نا یہاں اذ کے بعد زاغت اور بلغت دو دو صیغے " واحد مؤنث غائب بحث اثبات فعل ماضی معروف " کے ہیں۔ مگر فوراً ہی ان پر عطف ہوتا ہے صیغہ مضارع کا۔ مگر یہاں بھی و جعلتم تظنون مراد ہے۔ اس لئے شعر میں " واذ " ہی پڑھئے جب بھی شعر ہر حیثیت سے صحیح

بلکہ فصیح ہے۔

دوسرا شبہ مخطوطات قدیمہ پر نقطے نہیں نظر آتے، یا قدیم مصاحف پر بھی نقطے نہیں ہیں۔ تو نہ ہوں میں نے یہ کب کہا کہ زمانہ جاہلیت یا آغاز اسلام میں عربی لکھنے والے سب کے سب منقوط حروف پر نقطے ضرور لگاتے تھے۔ یا قرآن مجید کی کتابت کا آغاز جس وقت سے ہوا اسی وقت سے اس کے ہر منقوط حروف پر نقطے ضرور لگائے گئے۔ اگر میرا یہ دعویٰ ہوتا تو بے شک مخطوطات قدیمہ کے فوٹو اور مصاحف قدیمہ کا عکس حاصل کرکے مجھ کو قائل کیا جاسکتا تھا اور "فیصلہ کن اتمام حجت" کا سامان مہیا کیا جاتا۔

مودودی صاحب لکھتے ہیں۔ "یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ جس رسم خط میں ابتداء نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے وحی کی کتابت کرائی تھی اور جس میں حضرت ابوبکرؓ نے پہلا مصحف مرتب کرایا تھا، اور حضرت عثمانؓ نے جس کی نقل بعد میں شائع کرائی تھی اس کے اندر نہ صرف یہ کہ اعراب نہ تھے بلکہ نقطے بھی نہ تھے کیونکہ اس وقت تک یہ علامات ایجاد نہیں ہوئی تھیں۔" اسی سلسلے میں تھوڑا آگے چل کر مودودی صاحب لکھتے ہیں۔

"پھر یہ بھی ایک تاریخی حقیقت ہے کہ قرآن میں اعراب لگانے کی ضرورت سب سے پہلے بصرے کے گورنر زیاد نے محسوس کی جو ۴۵ ھ سے ۵۳ ھ تک وہاں کا گورنر رہا تھا۔" اس نے ابوالاسود دوئلی سے فرمائش کی کہ وہ اعراب کے لئے علامات تجویز کریں اوز انہوں نے یہ تجویز کیا کہ مفتوح حرف کے اوپر مکسور حرف کے نیچے اور مضموم حرف کے بیچ میں

ایک ایک نقطہ لگا دیا جائے۔

اس کے بعد عبدالملک بن مروان (۶۵ ھ سے ۸۶ ھ) کے عہد حکومت میں حجاج بن یوسف والئ عراق نے دو علماء کو اس کام پر مامور کیا کہ وہ قرآن کے متشابہ حروف میں تمیز کرنے کی کوئی صورت تجویز کریں۔ چنانچہ انہوں نے پہلی مرتبہ عربی زبان کے حروف میں بعض کو منقوط، بعض کو غیر منقوط کرکے اور منقوط کے اوپر یا نیچے ایک سے لے کر تین تک نقطے لگا کر فرق پیدا کردیا۔ اور ابوالاسود کے طریقے کو بدل کر اعراب کے لئے نقطوں کے بجائے زیر زبر پیش کی وہ حرکات تجویز کیں جو آج مستعمل ہیں۔"

مجھ کو جو اختلاف ہے وہ مودودی صاحب کی خط زدہ عبارت خصوصاً اس میں جو الفاظ چوب خط لکھ دیئے ہیں ان سے ہے۔ مودودی صاحب فرماتے ہیں کہ عہد خلفائے راشدین تک عربی رسم خط میں نقطوں کا وجود ہی نہ تھا۔ "کیونکہ اس وقت تک یہ علامات ایجاد نہیں ہوئی تھیں۔" ۶۵ھ سے ۸۶ ھ تک کے اندر ان کے نزدیک " پہلی مرتبہ عربی زبان کے حروف میں بعض حروف منقوط بنائے گئے۔" میں کہتا ہوں کہ یہ غلط ہے خلاف عقل ہے کہ عربی رسم خط کئی صدی پہلے ایجاد کیا جائے اور اس رسم خط کے نقطے کئی صدی کے بعد ایجاد کئے جائیں۔ نقطے نہ دینا اور بات ہے اور نقطے نہ ہونا اور بات ہے۔ اس لئے مخطوطات قدیمہ کے فوٹو وغیرہ کا ذکر کرکے اور مصاحف قدیمہ کے کم سے کم ایک صفحے کا عکس منگوانے کی فرمائش کرکے اصل بحث کو یا تو غتربود قصداً کیا جاتا ہے یا اصل بحث کو چونکہ سمجھا ہی نہیں ہے اس لئے اس طرح کی باتیں نادانستہ کی جارہی ہیں

جن سے اصل بحث نظروں سے اوجھل ہوجائے۔
لقطے بعض قدیم مصاحف پر بھی ہیں مگر اس کا کیا جواب ہے کہ کوئی کہہ دے یا لکھ دے کہ یہ لقطے بعد کو کسی نے لگا دیئے ہیں اور ایسا کہنے والے یا لکھنے والے اسی شہرت کی بناء پر کہتے ہیں اور لکھتے ہیں کہ پہلے تو عربی رسم خط میں لقطے کا وجود ہی نہ تھا۔ ۶۵ ھ سے ۸۶ ھ کے اندر تو لقطے ایجاد ہوئے ہیں اس لئے اس سے پہلے کے لکھے ہوئے مصاحف پر اگر لقطے ہیں تو وہ یقیناً بعد کو کسی نے لگا دیئے ہیں۔ اس لئے اب کوئی شخص مخطوطات قدیمہ عربیہ کے فوٹو یا مصاحف قدیمہ کے فوٹو کا ذکر چھیڑ کر دوسروں کو دھوکا دینے کی کوشش نہ کرے۔

ایک قرین عقل بات یہ بخوبی ممکن ہے کہ اعراب کے لئے بھی پہلے لقطے ہی ہوں۔ مگر رنگین لقطے۔ تاکہ حروف منقوطہ کے لقطوں سے ممتاز رہیں مگر اس میں دشواری تھی کہ لکھنے کے وقت کئی رنگ کی روشنائی رکھنے کی ضرورت کاتب کو پڑتی تھی۔ اس لئے بعد کو اعراب کیلئے رنگین لقطوں کی جگہ وہ شکل اختیار کی گئی جو آج تک مستعمل ہے۔

لقطوں کی بحث ایک دھوکا ہے (۱) جب مودودی صاحب کو خود اعتراف ہے کہ قرآن مجید کی تعلیم عہد نبوی میں زبانی تلقین کے ذریعے ہوا کرتی تھی۔ صحابہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے سن سن کر قرآن کی سور وآیات یاد کرتے تھے۔ آپ سے نمازوں میں برابر قرآن سنا کرتے تھے۔ تو پھر مصاحف میں حروف پر لقطے ہوئے تو کیا اور نہ ہوئے تو کیا۔ لعلموں اگر صرف لکھا ہوا ہو تو کوئی اس کو یعلمون پڑھے اور دوسرا

تعلمون پڑھے یہ ممکن ہے مگر جہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے صحابہ نے یعلمون ہی سنا ہے یائے تحتانیہ سے تو کوئی اس کو تعلمون تائے فوقانیہ سے کیوں پڑھنے لگا؟ مصحف میں نقطے نہ ہونے کے سبب سے صحابہؓ نے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا اور بار بار سنا تھا وہ کس طرح مشتبہ ہوسکتا ہے۔ اگر بالفرض ان میں کوئی شخص ضعیف الحافظ ہو اور اس کو یاد نہ رہا ہو کہ **ھو خیر مما یجمعون** میں **یجمعون** ہے یا **تجمعون** ۔ تو وہ جب کبھی کسی دوسرے کے سامنے تجمعون پڑھے گا وہ ضرور اس کو لقمہ دے گا اور اس کی تصحیح کردے گا۔ اگر وہ ضعیف الحافظہ کسی ایک کی تصحیح کو تسلیم نہ کرے گا تو وہ مصحح دو چار بلکہ دس بیس دوسرے لوگوں سے کہلواکر اس کی تشفی کردے گا۔ اس لئے ممکن ہی نہیں ہے کہ مصاحف میں نقطے نہ ہونے کے سبب سے صحابہؓ میں کبھی قرآت کا اختلاف ہوا ہو اور جب صحابہ میں اختلاف نہ ہوا تو صحابہؓ کے شاگردوں میں بھی اختلاف قرآت ہونے کی کوئی وجہ نہیں ہوسکتی۔

ہاں چند لوگوں نے قرآن مجید نہ کسی صحابی سے پڑھا نہ کسی تابعی سے۔ بطور خود کسی غیر منقول اور بغیر اعراب والے مصحف میں وہ پڑھنے لگے۔ تو ضرور ان لوگوں کے پڑھنے میں بعض جگہ اختلاف ہوگا۔ مگر ان مختلف فیہ الفاظ میں سے وہی ایک لفظ صحیح ہوگا جو جماعت نہ کسی صحابی سے قرآن مجید پڑھا نہ کسی تابعی سے ان کی من گھڑت قرآتوں کا اعتبار ہی کوئی مسلمان کیوں کرنے لگا؟

غرض جب تعلیم القرآن کا اصل دارومدار زبانی تلقی پر عہد نبوی وعہد صحابہ وعہد تابعین واتباع تابعین تک برابر رہا تو مصاحف کے منقوط و

غیر منقوط ہونے کا ذکر ہی محض دھوکا دینے اور ذہنوں کو منتشر کرنے کے لئے کیا جاتا ہے۔ امید ہے کہ آئندہ سے اختلاف قرآت کے اسباب بیان کرنے میں مصاحف قدیمہ کے منقوط و غیر منقوط ہونے کا کبھی ذکر نہ کیا جائے گا اور اس کا ذکر چھیڑنے والوں کے فریب میں کم سے کم ہمارے ناظرین کبھی نہ آئیں گے۔

و السلام علی من اتبع الھدیٰ

عربی حروف کے لئے نقطے کب ایجاد ہوئے

تاریخ، لغت اور اشعار جاہلیت کی روشنی میں

تحقیق از جناب رحمت اللہ طارق۔ دار الحدیث مکۃ المکرمہ

ریسرچ اور تحقیق کے میدان میں شاذ و نادر ہی کوئی گروہ ایسا ہوگا جو تبلیغی مقاصد بھی رکھتا ہو اور مخالف پر تنقید کرتے وقت حق و انصاف کا دامن بھی اس کے ہاتھ سے چھوٹنے نہ پایا ہو۔ اس کلیہ کی صداقت اس وقت اور بھی نکھر کر ہمارے سامنے آجاتی ہے جب ہم دیکھتے ہیں کہ مستشرقین یورپ نے اپنے تبلیغی مقاصد کے پیش نظر اسلام پر جتنا کچھ مواد فراہم کیا ہے اس میں اسّی فیصد اسلام اور پیغمبر اسلام، بالخصوص قرآن مجید پر طعن و تشنیع ہی کا مواد ملے گا۔ کیونکہ شروع ہی سے ان کا مطمح نظر یہی رہا ہے اور اپنی تحقیقات کا محور اسی کو گردانا ہے کہ جس وار سے بھی قرآن لاریب فیہ، کی پوزیشن مشکوک و مشتبہ ہو سکتی ہے اسے مختلف انداز سے استعمال کیا جائے۔ چنانچہ عربی ہجاء کے اٹھائیس حروف میں سے بائیس کے قریب متشابہ حروف ہیں یعنی اگر نقطے اڑا دیئے جائیں تو ان میں امتیاز کی کوئی صورت باقی نہیں رہتی۔ اب اعتراض یہ کیا جاتا ہے کہ جب عربی خط اپنے ابتدائی ادوار میں "بے نقط" تھا تو ان متشابہ حروف میں امتیاز کرنے کی کیا صورت ہو سکتی تھی؟ چنانچہ اس مزعومہ عقیدے کی بنا انھوں نے یہ اعتراض کھڑا کر دیا کہ "قرون اول میں جب نقطوں کا رواج نہیں تھا یا اہل عرب اس سے آشنا ہی نہیں تھے تو قرآن کے سیکڑوں الفاظ جو قاری اپنی صوابدید کے مطابق پڑھا کرتے تھے وہ یا تو صحیح مانے جائیں یا سب کے سب غلط، صحیح ماننے کی صورت میں "تواتر" کا سوال ختم ہو جانا چاہئے اور غلط ماننے کے بعد صحت کا معیار باقی نہیں رہتا۔ مقصد یہ کہ قرآن حمید کی عصمت

حفاظت اور عظمت کا جو سکہ بیٹھ گیا ہے اسے کسی طرح نقصان پہنچایا جائے لیکن ـــــ "پھونکوں سے یہ چراغ بجھایا نہ جائے گا" ــــ فلسفۂ ابن رشد صدیوں سے یورپ کے رگ و پے میں سرایت کر چکا تھا اس کا اثر زائل کرنے کے لئے قرآن سے یوں بدلہ لینا خفت، سبکی اور جہالت کی بد ترین مثال ہے۔ تاہم اتنا کہہ کر ہم بھی سستی گلو خلاصی کے قائل نہیں ہیں۔ اگر اعتراض معقول ہے اور اپنے اندر وزن رکھتا ہے تو خالی عقیدت سے ہٹ کر علمی بنیادوں پر گفتگو کرنی چاہیئے، پھر بارے غنیمت ہے کہ غیر مسلم مشینریوں نے جاہلی لٹریچر کے وجود سے نہ تو انکار کیا ہے اور نہ ہی جاہلی شواہد سے استدلال کو رد سمجھا ہے۔

عرصہ ہوا میں نے قرآن سے متعلق چند مضامین تحریر کئے تھے جو بحمد اللہ اپنے موضوع میں منفرد اور مواد میں سیر حاصل تھے۔ انہی میں ایک ذیلی عنوان نقاطِ قرآن تھا۔ اور یہی حصہ جو متعلقہ معلومات بروقت دستیاب نہ ہونے کے سبب زیادہ مبہم، غیر واضح اور تشنہ تھا۔ جس کی وجہ متعلقہ مواد کا نہ ملنا تھا۔ چنانچہ میں نے مسلسل ایسے مواد کی تلاش جاری رکھی جو تصویر کے دوسرے رخ کی پوری وضاحت پیش کر سکے۔

آج الحمد للہ اس سلسلہ میں فکر و نظر کی کتنی وادیاں طے کرنے اور تحقیق و جستجو کے کتنے راستوں پر آبلہ پائی کرنے کے بعد ان کا ماحصل متلاشیانِ حق و صداقت کے سامنے پیش کرنے کے قابل ہو گیا ہوں۔ مضمون کی ترتیب اور بیسیوں کتابوں کی فراہمی اور حرم مکی کی وسیع و عریض لائبریری سے استفادہ۔ پھر اخذ و استنباط کے لئے شواہد اور جاہلی لٹریچر سے متعلق دواوین کی تلاش اور پھر مقصد کے تعین میں جتنی محنت صرف ہوئی اس کا بدلہ یہی چاہتا ہوں کہ جن کے دل میں اسلام، قرآن اور سنت کی قدر اور محبت ہے وہ اسے کسی سوءِ ظن پر محمول نہ کرتے ہوئے پورے شغف اور انہماک سے پڑھیں یہ ایک طالبانہ علمانہ پیش کش ہے اور پھر اردو میں اپنی نوعیت کا یقیناً پہلا مقابلہ ہے جس میں غلطی کا امکان ہو سکتا ہے۔ آپ اسے غور سے پڑھیے، ممکن ہے آپ غلطیوں کی اصلاح میں معاون و مددگار ثابت ہو سکیں۔

وباللہ التوفیق۔

نوٹ:۔ یہ قطعاً غیر مذہبی اور غیر سیاسی مقالہ ہے آپ صرف علمی نقطۂ نظر سے تعاون فرمائیں۔

اُمیّت کا مفہوم یہاں ضمناً اس بات کی وضاحت کر دی جائے کہ اصل مضمون یعنی "عربی خط میں نقطوں کا رواج" سے پہلے اُمیّت کا مفہوم اور عربی خط کی ابتداء پر دو ذیلی اور تعارفی نوٹ دیئے جاتے ہیں تاکہ آگے چل کر "مضمون کا اصل حصہ آپ کی دلچسپی کا باعث بن سکے" وہو ہذا۔

عام طور پر ہمارے ہاں اُمیت (ان پڑھ ہونے) کو فضائل نبوت میں شمار کیا جاتا ہے۔ اس سے بحث نہیں لیکن اس سے یہ اخذ کرنا کہ تمام عرب تھے ہی ان پڑھ تو اس کی صحت مشتبہ اور صداقت غیر یقینی ہے امام ابن فارس ابوالحسین۔ احمد بن فارس بن زکریا (متوفی سنہ ۳۹۵ھ / ۱۰۰۴ء) نے اس نظریہ کی شدید مخالفت کرتے ہوئے "الصاحبی" میں سینکڑوں صحابہ اور مشرکین کے نام گنوائے ہیں جو پڑھے لکھے اور مختلف علوم و فنون میں اچھی دسترس رکھنے والے تھے اور بعد میں لکھا ہے کہ وما العرب فی قدیم الزمان الا کنحن الیوم فما کل یعرف الکتاب والخط والقرأۃ یعنی قدیم زمانے کے عرب ہماری ہی طرح تھے، جس طرح ہم میں سے ہر شخص لکھا پڑھا نہیں ہوتا اسی طرح ان میں بھی سب کے سب نہ تو ان پڑھ تھے اور نہ ہی پڑھے لکھے۔ (الصاحبی جلد ۵ ص۱۱ طبع مصر سنہ ۱۹۱۰ء)

بعض لوگ اور خاص کر مستشرقین جب یہ ثابت کرتے ہیں کہ قرآن نے جاہل طبقہ کو للکارا اور انہیں ہی ہر میدان میں دعوت مقابلہ دیتا رہا۔ اگر کسی مہذب یا تعلیم یافتہ سوسائٹی کو مخاطب کرتا تو یقیناً اس کی اعجازی طاقت کا پول کھل جاتا۔ تو وہ اپنی تائید میں قرآن حکیم کی ان آیات (آل عمران ۲۰، ۷۵، جمعہ ۲) سے بھی استدلال کرتے ہیں یعنی ان میں "اُمیین" کا لفظ مذکور ہوا ہے جس سے صاف مترشح ہوتا ہے کہ وہ ان پڑھ ہی تھے وغیرہ۔ لیکن ہماری رائے میں یہاں اُمیت سے مراد کتابی اُمیت ہے علمی اُمیت نہیں۔ یعنی قرآن سے پہلے ان کے پاس ایسی دینی کتاب نہیں

تھی جس طرح کہ اہل کتاب یہود و نصاریٰ کے پاس تورات و انجیل تھے۔ علامہ حسنین محمد مخلوف "کلمات القرآن" میں امیین کے ذیل میں ایک جگہ لکھتے ہیں "مشرکی العرب" یعنی عرب کے مشرک (ص۳۴) دوسری جگہ تحریر کرتے ہیں "العرب المعاصرین لہ (ص) یعنی وہ عرب جو آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ہم عصر تھے (ص۳۴) پھر یہ نہ صرف ہماری یا مفتی مخلوف کی اپنی رائے ہے بلکہ قرآن حمید کی ذیل کی آیت سے بھی یہی کچھ مستفاد ہوتا ہے۔ وَمِنْهُمْ أُمِّيُّونَ لَا يَعْلَمُونَ الْكِتَابَ إِلَّا أَمَانِيَّ وَإِنْ هُمْ إِلَّا يَظُنُّونَ فَوَيْلٌ لِّلَّذِينَ يَكْتُبُونَ الْكِتَابَ بِأَيْدِيهِمْ ثُمَّ يَقُولُونَ هَٰذَا مِنْ عِندِ اللَّهِ لِيَشْتَرُوا بِهِ ثَمَنًا قَلِيلًا فَوَيْلٌ لَّهُم مِّمَّا كَتَبَتْ أَيْدِيهِمْ وَوَيْلٌ لَّهُم مِّمَّا يَكْسِبُونَ (بقرہ ۷۸ تا ۷۹)

حاصل ترجمہ یہ کہ۔ ان میں ایک فریق ایسا بھی تھا جو امی یعنی علم کتابی سے نا آشنا تھا ہاں جھوٹ موٹ کا تو انہیں علم تھا (لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ صرف) ان کا اپنا ظن (ہی ظن) تھا پس جو لوگ جلب منفعت کے لئے اپنے ہاتھوں کی تحریر کو کتاب اللہ کہہ کر لوگوں کو سستے داموں بیچتے ہیں۔ ان کے حال پر نہایت افسوس ہے (بلکہ) ان کا یہ عمل اور جو کچھ انہوں نے اس (عمل) کے ذریعہ کمایا سب سامان ہلاکت کی تمہید ہے۔

اب یہاں اگر کتابی امیت مقصود نہ ہوتی تو اللہ تبارک و تعالےٰ ان کے لکھنے کی خبر کیونکر دیتا؟ حقیقت یہ ہے کہ وہ دین کا انکار کر رہے تھے اور دین ہی سے جہالت کے بعد ان کا تو سیدھا ہو سکتا تھا ـــ وہ نفس تعلیم سے آشنا تھے مگر صاحب کتاب نہیں تھے یعنی کتابی امی تھے مفسر ابن جریر طبری (۳۱۰ھ) اپنی اسناد سے حضرت عبداللہ بن عباسؓ (متوفی ۶۸ھ) سے روایت کرتے ہیں کہ الامیون قوم لم یصدقوا رسولا ارسلہ اللہ ولا کتاب انزلہ اللہ فکتبوا کتابا بایدھم ثم قالوا لقوم سفلۃ جھال ھذا من عند اللہ وقال قد اخبرانھم یکتبون بایدیھم ثم سماھم امیین لجحودھم کتاب اللہ و رسولہ یعنی امیوں سے وہ قوم مراد ہے جس نے نہ تو کسی رسول کی تصدیق کی اور

نہ ہی کسی کتاب الٰہی پر ایمان لے آئی (اس کے باوجود) اپنے ہاتھوں سے کتاب لکھ کر نچلے درجہ کے جاہلوں سے کہتے تھے کہ یہ کتاب الٰہی ہے۔ (حضرت ابن عباسؓ نے مزید کہا کہ) اللہ تبارک نے خبر دی کہ وہ اپنے ہاتھوں سے لکھتے تھے پھر بھی انہیں امی کہا (یعنی ان پڑھ) یہ اس لیے کہ وہ دراصل حقیقی ان پڑھ نہیں تھے۔ کتاب اللہ اور رسول اللہ کے انکاری تھے (تفسیر طبری شائع کردہ محمود محمد شاکر جلد دوم ص۲۵۸، ص۲۵۹) نیز المرأۃ فی الشعر الجاھلی ڈاکٹر احمد محمد حوفی طبع مصر ص۲۳۳، ص۲۳۴) ان آیات الٰہی کے علاوہ بعض لوگ "امیت" کے ثبوت میں ارشادات نبوی (صلی اللہ علیہ وسلم) کا سہارا بھی لیتے ہیں یعنی ان کا کہنا ہے کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے لکھنے سے نہ صرف منع فرمایا بلکہ لکھے ہوئے کو محو کرا دیا[1] لیکن ایسے حضرات کی خدمت میں التماس ہے کہ حضرت محمد صلے اللہ علیہ وسلم سے اتنے سوئے ظن کی کوئی ضرورت نہیں ہے آپ کے کسی بھی ارشاد کو ایسے غلط مفہوم پر محمول کرنا نہ صرف خوف خدا سے بعید ہے بلکہ علمی دیانت داری کے بھی منافی ہے قرآن حکیم میں ہے۔ نٓ ۔ وَالْقَلَمِ وَمَا یَسْطُرُوْنَ ۔ یعنی قلم اور قلم سے تحریر کی ہوئی چیزوں کو گواہ بنا کر "علم" و تحریر کی نہ صرف حوصلہ افزائی کی گئی ہے بلکہ در پردہ لکھنے اور پڑھنے کا حکم بھی دیا گیا ہے۔ کیا ایسے حکم کی موجودگی میں رسولؐ اللہ اپنی امت کو ان پڑھ بنا سکتے تھے؟ صلے اللہ علیہ وسلم۔ امام خطیب بغدادی (متوفی ۱۰۷۱ء) نے "تقیید العلم" میں پہلے تمام ان احادیث کا باسند ذکر کیا ہے جن میں لکھنے کی ممانعت ہے پھر اثبات کی احادیث لا کر بعد میں جو تبصرہ کیا ہے وہ ہمارے خیال میں ارشادات نبوی (صلی اللہ علیہ وسلم) کی بہترین توجیہ ہو سکتی ہے۔ خطیب کہتا ہے کہ

> "ان دونوں قسم کی احادیث کو ملانے سے واضح ہو جاتا ہے کہ صدر اول میں جن لوگوں نے کتابت کو ناپسند کیا تو اس کی وجہ یہ تھی کہ کوئی اور تصنیف کتاب اللہ کے ہم پلہ قرار نہ پا جائے اور یہ کہ لوگ کتاب اللہ کے

---

[1] یہ صرف احادیث (غیر از قرآن) کے لکھنے کے متعلق تھا مطلق کتابت کے متعلق نہیں تھا۔ قرآن کریم کی کتابت میں خود نبی اکرمؐ نے جس قدر اہتمام فرمایا اس کی وضاحت کی ضرورت نہیں۔

ماسوا کسی اور تحریر میں منہمک ہو کر کتاب اللہ سے بے نیاز نہ ہو جائیں
اسی بنا پر ہی قدیم مقدس کتابوں (تورات و صحیفہ دانیال وغیرہ) کی
تلاوت سے صحابہ کو روک دیا گیا تھا کیونکہ ان میں (اس وقت)
حق و باطل، صحیح اور فاسد کا امتیاز مشکل ہو چلا تھا اب صرف قرآن
ہی کافی تھا اور اسے ہی ان پر مہیمن (نگران) بنایا گیا تھا۔ پھر یہ
وجہ تھی کہ صدر اول میں ایسے فقیہ (سمجھدار) کاتبوں کی قلت تھی جو
وحی اور غیر وحی میں امتیاز کرنے پر قادر ہو سکتے۔ کیونکہ عربوں کی
اکثریت تفقہ فی الدین ہی میں جب فائق نہیں تھی اور نہ ہی انہیں
دین کی تفسیات کا علم رکھنے والے صحابہ اور علماء کی صحبت نصیب تھی
(تفقہ فی الکتابت تو دور کی چیز رہی) تو ایسے میں اندیشہ تھا کہ یہ لوگ
جو کچھ صحائف (کاپیوں) میں لکھا ہوا پاتے اسے قرآن ہی سے ملحق
کر دیتے۔ اور پھر آہستہ آہستہ یہ عقیدہ رکھنے لگ جاتے کہ جو کچھ
ان صحائف میں شامل ہے وہ کلام الرحمان ہی ہے۔

(تقیید العلم ص۵۷ طبع دمشق ۱۹۴۹ء)

خطیب نے اس توجیہ میں کہا ہے کہ فقیہ کاتبوں کی قلت تھی یہ نہیں کہا کہ عام طور پر کوئی کتابت جانتا ہی نہ تھا۔

امید ہے کہ حضرت ابن عباسؓ کی تفسیر کی روشنی میں امیت کا مفہوم واضح ہو چکا ہوگا۔ اب آپ عربی خط کی ابتدار کی طرف آیئے۔

عربی خط کی ابتدار

نقطوں سے پہلے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ عربی خط کی ابتدار کب سے ہوئی؟ کیونکہ جب تک کسی چیز کی ابتدار معلوم نہ ہو عوارض اور لوازمات کا علم غیر ضروری ہو جاتا ہے۔ ہمارے خیال میں اس سوال کا جواب نہ صرف مشکل ہے بلکہ محال بھی ہے کیونکہ عرب روایات اور مستشرقین کے اقوال اس قدر باہم متضاد، متعارض اور مختلف فیہ ہیں جن کی روشنی میں یہ فیصلہ کرنا نہ صرف دشوار بلکہ نا ممکن ہے تاہم عرب روایات کی رو سے

جہاں تک ظن غالب کا تعلق ہے اس کی ابتدا ہجرت نبوی (صلی اللہ علیہ وسلم) سے دوسو سال پہلے لخمی ایمپائر کے کالیڈی مرکز حیرہ (موجودہ کوفے سے ۳ ½ میل کے فاصلہ کے مقام پر) سے ہوئی (در اصل شاہان بنو لخم یمن سے نکل کر شام اور فلسطین چلے آئے تھے اور یہاں پہنچ کر انھوں نے نئی سلطنت کی داغ بیل ڈالی تھی)۔ اور انہوں نے "انبار" سے عربی خط سیکھا۔ انبار کالیڈیا میں فرات کے شمالی کنارے پر ایک قدیم اور متمدن شہر تھا جسے ۱۲ھ میں حضرت خالد بن الولید نے فتح کیا۔ اور انبار نے یمن کے حمیری خط کی نقل اتاری۔ حمیری یمن کے قدیم باشندے تھے جو سینکڑوں برس سے اپنی امتیازی خصوصیات اور علوم و فنون میں کامل دست گاہ رکھنے سے مشہور تھے۔ انہوں نے آخری وقت میں قسطنطین دوم (رومی ایمپائر کا نمائندہ ۳۴۰ء) کے عہد میں عیسائیت قبول کی۔ بہر حال حمیری خط کی ابتدا تحطانی عرب کے بولان قبیلہ کے تین افراد نے کی۔ بولان کا مورث اعلیٰ غضین بن عمرو بن الغوث بن طی بن داد بن زید بن یشجب بن عریب بن زید بن کہلان تھا۔ اس قبیلہ کے جن تین افراد نے عربی خط کو سنوارا اور نقطے ڈالے ان کے نام "نقطوں" کے عنوان میں ملاحظہ فرمایئے۔ (نیز مزید تفصیل کے لئے ذیل کی کتابیں ملاحظہ ہوں۔ فتوح البلدان ص۴۷۶ و ۴۷۷، کتاب المصاحف ص۴ ،۵، العقد ابن عبدربہ ص۲ ،۴، الوزراء والکتاب ص۱۲ ،۱۴۔ ادب الکاتب صولی ص۲۵ تا ۳۰۔ ابن فارس الصاحبی ص۷۔ التنبیہ علی حدوث التصحیف قلمی تیموری کتب خانہ مصر ص۳۰ تا ۳۵ صبح الاعشیٰ ص۳ ،۱۱۔ تاریخ اللغات السامیہ ولفنسن ص۱۶۱ ،۱۶۲۔ مجلۃ کلیۃ الآداب مئی ۱۹۳۵ء۔ ابن الندیم ص۶ تا ۸ وغیرہ۔

ان تاریخی نصوص (و تصریحات) سے واضح ہوا کہ جس طرح ہجرت نبویؐ سے دوسو سال پہلے۔ اہل حیرہ سے عربی خط کا آغاز ہوا۔ اتنا ہی عرصہ پہلے انبار اور حمیری قبیلہ اس کی ابتدا کر چکے تھے۔ یعنی دوسری تا تیسری صدی میلادی کے قریب۔ ادھر عرب روایات کی تائید ان حجری نقوش اور بردی کے چیتھڑوں پر لکھی ہوئی عبارتوں سے بھی ہوتی ہے جن کا زمانہ دوسو دس مسیح سے شروع ہو کر پانچسو گیارہ مسیحی

تک پہنچتا ہے۔ چنانچہ اس وقت تیسری صدی مسیحی تک کے جو نقوش دریافت ہوئے ہیں ان کی تعداد پانچ بتائی جاتی ہے۔ اور وہ یہ ہیں۔

۱۔ وہ تحریر جو سقوط سلع کے بعد ۱۰۴ سنہ میں لکھی گئی (یعنی سنہ ۲۱۰ء میں) اس کا طرز تحریر اسلامی خط کے ابتدائی دور سے ملتا جلتا ہے۔ حتیٰ کہ پہلی سطر کا چوتھا لفظ (بن) اور پانچویں سطر کا پہلا لفظ (یعلیٰ) اسلامی عربی خط کے بالکل مشابہ ہے۔

۲۔ دوسری تحریر جو پہلی تحریر کی طرح وادیٔ سینا کے قران جزیرہ میں دریافت ہوئی اس پر سقوط سلع کے بعد ۱۲۶ سنہ درج ہے (یعنی سنہ ۲۳۲ء) اس کی پہلی سطر کا لفظ (سلم) اور آخری سطر کا لفظ (بن) صاف پڑھے جاتے ہیں۔

۳۔ تیسری تحریر بھی وادیٔ سینا میں دریافت ہوئی جس پر سقوط سلع کے بعد ۱۴۸ سنہ درج ہے (یعنی سنہ ۲۵۳ء) اس کی پہلی سطر کا دوسرا لفظ (کلیب) اور اسی سطر کے دو آخری لفظ (بن عمرو) موجودہ عربی خط سے ملتے جلتے ہیں۔

۴۔ چوتھا نقش شمالی حجاز (مدینہ منورہ سے تقریباً ۳۰۰ میل) کی وادی حجر "مدائن صالح" میں برآمد ہوا جس کی تاریخ سقوط سلع کے بعد ۱۶۲ سنہ کی طرف لوٹتی ہے (یعنی سنہ ۲۶۷ء) اس کی پہلی سطر کا آخری لفظ (بن) اور تیسری سطر کا پہلا لفظ (عبد) اور چھٹی سطر کا آخری لفظ (لعن) اور نویں سطر کا دوسرا لفظ وہی (لعن) صاف پڑھا جاتا ہے۔

۵۔ ان سب سے جو نقش بعد میں دریافت ہوا وہ حوران منطقہ کے ام الجمال گاؤں میں بغیر تاریخ کے ملا ہے لیکن کانٹ (DEVOGUE) وغیرہ کے خیال میں یہ نقش سنہ ۲۷۰ میلادی کا ہے۔ اس کی دوسری سطر کا دوسرا لفظ ایک نام (سلی) اور اسی سطر کا آخری لفظ (جذیمہ) اور تیسری سطر کا پہلا لفظ (ملك) ہے جو بالکل صاف لکھا ہوا معلوم ہوتا ہے۔

چوتھی صدی مسیحی اس صدی میں صرف ایک ہی تحریر۔ حوران منطقہ کے مرکزی شہر نمارہ میں عرب کے بادشاہ امرؤالقیس بن عمرو کی قبر سے دریافت ہوئی ہے۔ کہنے کو تو پوری صدی کی یہ ایک ہی تحریر ہے

لیکن عربی رسم الخط کی تاریخ میں اس کی اہمیت اور قدر و قیمت سابقہ تمام تحریروں سے زیادہ ہے کیونکہ اس کے اکثر بلکہ قریب قریب سب کے سب الفاظ اپنی ہیئت ترکیبی اور صورت خطی کے لحاظ سے اسلام کے ابتدائی رسم الخط کے مشابہ ہیں اس کی پہلی سطر کا دوسرا تا ساتواں کلمہ اس طرح ہے۔ "نفس امرالقیس بن عمرو ملك العرب" اور دوسری سطر کا پہلا تا چھٹا کلمہ اس طرح ہے۔" وملك الاسدین ونزرو۔ وملوکھم وھرب مذ حجو" اور تیسری سطر کا پہلا اور پانچواں تا آخر کلمہ اس طرح ہے۔" الشعوب..... فلم یبلغ ملك مبلغه" اور چوتھی سطر کا پہلا، دوسرا اور تیسرا لفظ اس طرح ہے" عکدی (قوت) هلك - سنة"

الغرض یہ تحریر صورت خطی کے علاوہ زبان اور ادب وصوت کے لحاظ سے بھی زیادہ تر عربی ہی ہے بلکہ یہ تاریخ کے ایسے مرحلہ میں پہنچا دیتی ہے جس کی رو سے ہم عربی خط کے تدریجی ارتقاء اور تبدیلیوں کا صحیح اندازہ بھی کر سکتے ہیں۔ اس کے بعد آخر میں سقوط سلع کے بعد ۲۲۳ یعنی ۳۲۸ء درج ہے۔

چھٹی صدی میلادی

اس صدی کے تا حال دو نقش ملے ہیں پہلا نقش قنسرین اور فرات کے مابین "زبد" کے کھنڈرات میں دریافت ہوا جس کی تاریخ ۵۱۱ء میلادی کی طرف لوٹتی ہے یہ نقش تین زبانیں یونانی سریانی اور عربی میں کندہ کرایا گیا تھا اس کا رسم الخط اسلامی عہد کے کوفی رسم الخط کے مشابہ ہے بلکہ چند ایک کے ماسوا اس کے تمام تر الفاظ بھی عربی ہی ہیں۔ الا یہ کہ اس کے بعض حروف ابھی تک صحیح طور پر نہیں پڑھے جا سکے۔ مثلاً پہلی سطر اس طرح ہے "...... الالہ شرحوبو ۔۔۔ منفور........ یرامویٔ القیس" دوسری سطر یوں ہے " وشرحو بو سعن و وستو و وشریحو"

دوسرا نقش سقوط سلع کے بعد ۴۶۳ یعنی ۵۶۸ء میلادی کا ہے جو شام کے شمالی علاقے میں جبل دروز سے متصل حران (شہر) کے "لیجا" گرجا گھر میں

ملا ہے اس پر یونانی اور عربی میں اس طرح لکھا ہوا ہے۔ پہلی سطر" انا شرحیل بن ظلمولینیٹ ھذا المرطول"۔ دوسری سطر" سنہ ۴۶۳" تیسری سطر" خیبر" چوتھی سطر" بعام"۔ ولفنسن، تاریخ اللغات السامیہ (ص۱۹۲) میں لکھتا ہے کہ امرار بنی غسان میں سے حارث بن ابی شمر نے خیبر کو تاخت و تاراج کر کے لوگوں کو غلام بنایا اور غلام بنا کر پھر رہا کر کے شام کی طرف رُخ کیا اس تحریر میں اسی واقعہ کا ذکر ہے۔

ان نقوش میں پانچویں صدی میلادی کا نقش نہیں ملا۔ اور یہی وہ خلا ہے جسے علمائے لسانیات پُر کرنے کی ان تھک محنت کر رہے ہیں کیونکہ اس کے بغیر عربی تحریر کی تاریخ کا تسلسل غیر مربوط ہو جاتا ہے لیکن عرب کے ریتلے صحرا، پہاڑی غار اور سینکڑوں تباہ شدہ شہر جو کھدائی کے انتظار میں ساکت و صامت کھڑے ہیں ان کی کھدائی نہ صرف اس تسلسل کو ٹوٹنے سے بچائے گی بلکہ بہت سے اسرار و غوامض سے بھی نقاب کشائی کی توقع کی جا سکتی ہے۔

ان تمام تحریروں اور نقوش کے عکس بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ "چربے" "کتاب" مصادر الشعر الجاہلی مصنفہ ڈاکٹر ناصر پی، ایچ، ڈی، قاہرہ (طبع اول ۱۹۵۶ء ص۲۶، ۲۸، ۳۰ پر ملاحظہ ہوں) ان نقوش سے اتنا پتہ چلا کہ عربی خط اسلام سے بلاواسطہ دو سو سال اور بالواسطہ چار سو سال پہلے رائج ہو چکا تھا۔ اور واضعوں کے بلند مذاق کی وجہ سے تمام عیوب و نقائص سے اسے پاک و صاف رکھنے کی کوشش کی گئی تھی۔ پاک و صاف سے مراد۔ خط کی نوک پلک یا تہذیب مراد نہیں ہے بلکہ وہ عیب جو ایک کثیر التشابہ زبان میں ہو سکتے ہیں۔ اس کے بعد اسلامی عہد کا آغاز ہوتا ہے یہاں پہنچ کر ہمیں اگرچہ مایوسی ہوتی ہے کہ مسلمانوں کی بے توجہی سے قرن اول کا اتنا قیمتی اثاثہ یوں لاپروائی کی نذر ہو گیا کہ آج ہم پورے وثوق سے کلام پاک کا کوئی نسخہ بھی موجود نہیں پاتے

ؔلہ غالباً یہ بتانا مقصود ہے کہ نبی اکرمؐ کے عہد مبارک کا لکھا ہوا قرآن کریم کا کوئی نسخہ اس وقت تک دریافت نہیں ہوا۔

تاہم اتنا غنیمت ہے کہ تاریخ کے بے رحم ہاتھوں سے بچ بچا کر اس مبارک عہد کی دو تحریریں اس وقت بھی ہمارے پاس موجود ہیں اور اب ہم عربی تاریخ کے ضمن میں اخذ نتائج اور استنباط میں بھٹک نہیں سکتے۔ پہلی تحریر حضرت عثمان بن عفانؓ (شہید ۶۵۵م) کے زمانے کی ہے جس پر اکتیس ۳۱ ہجری کی تاریخ درج ہے۔ یعنی سنہ ۶۵۲ میلادی۔ یہ تحریر "عربک میوزیم" قاہرہ میں زیر نمبر ۹ محفوظ ہے۔

دوسری تحریر بحمداللہ اس سے بھی قبل کی ہے یعنی غزوۂ خندق ۵ھ ہجری مطابق ۶۲۷م) کی جو کہ مدینہ منورہ کی سلع پہاڑی کی جنوبی چوٹی سے برآمد ہوئی۔ (تفصیل ملاحظہ ہو مصادر الشعر الجاہلی ص۲۴ تا ص۳۳)

اس تفصیل سے آپ نے اتنا تو معلوم کر لیا کہ عربی خط کی ابتدا اسلام سے بہت پہلے ہو چکی تھی۔ اب رہا یہ سوال کہ ان کتبات و نقوش میں سے اکثر ایسے ہیں جو نقطوں سے عاری ہیں۔ تو اس کے متعلق ذیل کی معروضات حاضر ہیں۔ دیہی وہ معروضات ہیں جن کے لئے آپ کو انتظار کی زحمت اٹھانی پڑی۔

نقطوں کی ابتداء

سابقہ سطور میں دس کتابوں کے حوالے سے یہ ثابت کیا جا چکا ہے کہ عربی خط کی ابتدا اسلام سے محتاط اندازے کے مطابق چار سو سال پہلے ہو چکی تھی اور اسے مہذب بنانے، درجۂ کمال تک پہنچانے اور لفظی تشابہ دور کرنے والے بولان قبیلہ کے تین افراد تھے۔ ان تین افراد میں سے ایک کا نام عامر بن جدرہ تھا جس نے عربی خط میں نقطوں کا اضافہ کیا۔ یہ روایت فنی لحاظ سے اگرچہ اتنا فائدہ نہیں دے سکتی جتنا کہ مطلوب ہے۔ تاہم تاریخی طور پر ہم آسانی سے اتنا سمجھ سکتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن عباسؓ الاعجام (نقطوں) کے موجودہ مفہوم سے آشنا ضرور تھے۔ اور کہ یہ لفظ (الاعجام) اپنے اسی مفہوم میں حضرت ابن عباسؓ سے پہلے بھی رائج، مشہور اور معروف تھا۔ یا کم از کم حضرت ابن عباسؓ سے نچلا راوی اس کے مفہوم سے پوری طرح واقف تھا اور اسی طرح لوگوں کے لئے بھی یہ لفظ اسی مفہوم میں اجنبی نہیں تھا۔ جب ہی تو انھوں نے راوی کی سنی اور سن کر اسے تسلیم کر لیا۔

بہر حال یہ بات کہ نقطوں کے موجد حجاج بن یوسف (متوفی ۹۵ھ/۷۱۴ء) یا یہ شہرت کہ ابو الاسود دؤلی (متوفی ۶۹ھ/۶۸۸ء) تھے قطعاً غلط اور ثبوت کے لحاظ سے تاریخ پر افتراء ہے۔ کیونکہ نقطوں اور عربی خط کی ابتداء ان کے پیدا ہونے سے پانچسو سال پہلے ہو چکی تھی۔ مشہور مورخ و نساب اور لغوی امام احمد بن علی بن احمد معروف (متوفی ۸۲۱ھ/۱۴۱۸ء) اپنی شہرۂ آفاق کتاب "صبح الاعشٰی جلد سوم ص۱۵۵ پر لکھتا ہے کہ

"والظاهر ما تقدم یعنی ان الاعجام موضوع مع وضع الحروف اذ یبعد ان الحروف قبل ذالك مع تشابه صورها كانت عرية عن الى حين نقط المصحف یعنی اوپر کی تفصیل سے معلوم ہوا کہ جوں ہی عربی کے حروف وضع کیے گئے تھے نقطے بھی ساتھ ہی وضع کیے گئے کیونکہ یہ بعید از عقل ہے کہ صوری مشابہت کے باوجود عربی حروف کو اس وقت تک نقطوں سے خالی رکھا گیا جب تک کہ مصحف پر نقطے نہیں ڈالے گئے؟ (نیز ملاحظہ ہو مفتاح السعادۃ ومصباح السیادۃ لاحمد بن مصطفٰے عرف طاش کبرے زادہ متوفی ۹۶۸ھ/۱۵۵۹ء جلد اول ص۸ طبع مصر)

مصحف نبوی پر بھی نقطے تھے

سلف صالحین کا یہی عقیدہ تھا اور ہر مسلمان کا یہی عقیدہ ہونا چاہئے کہ قرآن مجید پر زبر، زیر، پیش (اور نقطوں) جیسا بنیادی اور عظیم کام آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم خود ہی سر انجام دے گئے تھے (اتقان ص۱۴۴ تا ص۱۴۷) بلکہ آپ نے اپنی امت کو حکم دے دیا تھا کہ اعربوا القران۔ یعنی قرآن پر اعراب لگاؤ (بیہقی، ابو یعلی بحوالہ مشکوٰۃ ص۱۸۱، جامع صغیر جلد اول ص۳۸، منتخب کنز العمال جلد اول ص۳۸۶، تاریخ خطیب جلد ۸ ص۷۷، بغیۃ الوعاۃ ص۱۵۷، فضائل ابن کثیر ملحق بہ تفسیر ابن کثیر ص۲۰ وغیرہ) یہاں اعراب سے مراد تحریر کے تمام وہ قواعد و ضوابط ہیں جو عہد نبوی میں رائج تھے۔ تنہا زبر، زیر، پیش نہیں۔ کیونکہ حقیقی تشابہ نقطوں ہی سے دور ہو سکتا تھا۔

بہرحال اس امر نبوی کے مطابق مصاحف نبوی پر نقطے لگائے گئے لیکن اس کے بعد پھر کیا ہوا؟ اس کی تفصیل عرض ہے۔ امام شمس الدین محمد بن عرف جزری (متوفی ۸۳۳ھ / ۱۴۲۹ء) لکھتے ہیں کہ ثم ان الصحابۃ رضی اللہ عنہم لما کتبوا تلك المصاحف جردوھا من "النقط" والشکل لیحتملہ مالم یکن فی العرضۃ الاخیرۃ مما صح عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم یعنی بعد میں جب صحابہ کرامؓ نے نبوی مصاحف کو لکھنا شروع کیا تو انھوں نے نقطے اور دیگر علامات کو اڑا دیا کیونکہ جو الفاظ مختلف قرأتوں سے پڑھنا ثابت تھے (کہاں ثابت تھے؟ ثبوت ندارد۔ طارق) ـــــ اب دیکھنا یہ تھا کہ ان الفاظ کو آخری مرتبہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کس طرح تلاوت فرمایا۔ تاکہ مجمع علیہا فیصلہ کے بعد ہی آخری قرأت کو ضبط تحریر میں لایا جائے (اور نقطوں سے اس چیز کا پہلے ہی تعین ہوجاتا تھا جو کہ ناقلین کو منظور نہیں تھا)۔ (النشر فی القرأت العشر طبع دمشق جلد اول ص۳۲ تا ص۳۳ طبع قاہرہ ص۳۳)

امام جزری نے مذکورہ کتاب اختلاف قرأت کو ثابت کرنے کے لئے لکھی ہے مگر "نقاط" کے ضمن میں انہیں یہ اعتراف کرنا ہی پڑا کہ صحابہ کرامؓ نے حذف کردیئے تھے (رسول اللہ نے لگوادیئے تھے) حضرت عبداللہ بن مسعودؓ (متوفی ۳۲ھ / ۶۵۲ء) فرماتے ہیں کہ جردوا القرآن لیربو فیہ صغیرکم ولاینأ عنہ کبیرکم۔ یعنی قرآن کو نقطوں سے صاف کردو تاکہ چھوٹے بھی اسی طرح پڑھتے رہیں اور بڑے بھی دور نہ جائیں، مقصد یہ کہ انھیں ذہن پر زور دے کر الفاظ حل کرنے پڑیں گے اور اس طرح وہ قرآنی ماحول ہی کے ہو جائیں گے یعنی کسی بہانے قرآن ہی ان کی دلچسپی کا مرکز ہوگا۔ بہرحال حضرت ابن مسعودؓ کے اسی جردوا کی تفسیر میں امام زمخشریؒ (متوفی ۵۳۸ھ / ۱۱۴۳ء) لکھتے ہیں کہ اراد تجریدہٗ عن "النقط" والفواتح والعشور لئلا ینشأ نشئٌ فیری انھا من القرآن۔ یعنی جردوا سے ان کی مراد یہ ہے کہ قرآن کو نقطوں اور سورتوں کے تعارفی فقروں مثلاً "سورۃ الفاتحہ مکیہ وہی سبع آیات" اور ہر دس آیات کے بعد (اس زمانے میں) ایک آیت لگانے کا جو رواج تھا انھیں

حذف کرنا چاہیئے کیونکہ آگے چل کر کسی کے دل میں یہ خیال پیدا نہ ہو کہ یہ بھی عین قرآن ہی ہیں (الفائق زمخشری جلد اول ص۱۶۱ طبع مصر) یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان (اعربوا) اور عمل (تلك المصاحف) کے برعکس ان علامات و رموز کو اڑا دیا گیا۔ خیر اس سے بحث نہیں۔ تاہم ان دو حوالوں سے اتنا تو واضح ہو ہی گیا کہ حجاج اور دؤلی سے پہلے ہی صحابہ کرامؓ "نقطوں" کے موجودہ مفہوم سے بخوبی واقف تھے۔

اور یہ کہ یہ نقطے آں حضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے مصاحف پر باقاعدہ لگائے گئے تھے لیکن نقل ثانی کے وقت یا بالفاظ دیگر آں حضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد نقطوں کو جان کر حذف کر دیا گیا۔ (روایات کی روشنی میں۔ طارق)

یہاں یہ وضاحت کر دی جائے کہ بعض بزرگوں نے "تجرید" سے مراد تفسیر، تشریح، حدیث یا قصہ وغیرہ بھی لی ہے یعنی ان چیزوں کو قرآن سے الگ کر دیا جائے لیکن امام جزری اور امام زمخشری کی طرح قاضی ابوبکر محمد بن عبداللہ ابن العربی (متوفی ۵۴۳ھ) نے بھی تجرید سے نقطے ہی مراد لئے ہیں اور اس پر اس نے تفصیل سے لکھا ہے کہ اس طرح صحابہ کرامؓ اختلاف قرأت کا حق محفوظ رکھنا چاہتے تھے۔ کیونکہ نقطے ڈالنے سے قرأت کا خود بخود تعین ہو جاتا تھا تفصیل ملاحظہ ہو۔

العواصم من القواصم لابن العربی طبع الجیریا (جلد دوم ص۱۹۶-۱۹۷)

صحابہ کرام نقطے لگاتے تھے

امام ابوزکریا یحیٰ بن زیاد معروف فراء نحوی (متوفی ۲۰۷ھ / ۸۲۲ء) روایت کرتے ہیں کہ سفیان بن عیینہ (متوفی ۱۹۸ھ) نے اپنی سند سے اس میں حدیث بیان کی کہ کتب فی حجر لسر۔ ولد یلس (الحدیث) یعنی ایک پتھر پر یہ الفاظ لکھے ہوئے تھے۔ اب جو میں دیکھتا ہوں تو زید بن ثابت (متوفی ۴۵ھ) نے پہلے لفظ پر چار نقطے ... دیئے یعنی سین پر تین نقطے ڈال کر شین بنا دیا ... اور ... پر ایک نقطہ ڈال کر زا میں تبدیل کر دیا۔ اسی طرح دوسرے لفظ میں نقطوں کے

علاوہ سین کے بعد حار کا اضافہ کرکے نحو یتسنہ بنا دیا (معانی القرآن فراء جلد اول صفحہ ۱۷۱ طبع مصر) کیا حضرت زید بن ثابتؓ نقطوں کا علم نہ رکھتے تھے یوں ہی قرآن میں سین کو شین اور راء کو زاء بنا لیتے تھے؟ کیا یہ کام بغیر واقفیت کے ممکن ہوسکتا تھا؟ ہمارے خیال میں حضرت زیدؓ چونکہ کاتب الوحی تھے۔ جس طرح مصاحف نبوی میں نقطے ڈالنے سے مشق ہوگئی تھی بعد میں بھی جب کہیں کوئی لفظ بے نقط لکھا پاتے تو سنت نبویؐ کے مطابق فوراً بانقط بنا دیتے تھے لقد کان لکم فی رسول اللہ اسوۃ حسنۃ۔ اور صحابہؓ سے بڑھ کر اسوۃ الرسولؐ کا زیادہ پابند کون ہوسکتا تھا؟

تابعین کی اطلاع

عبداللہ بن سلیمان بن اشعث ابن داؤد سجستانی متوفی ۳۱۶ھ اپنی سند کے ساتھ بیان کرتا ہے کہ

الحجاج بن یوسف غیّر فی مصحف عثمان احد عشر حرفا.....

وکانت فی یونس (۲۲) ھوالذی ینشرکم فغیّرہ یسیرکم یعنی حجاج بن یوسف نے عثمانی مصحف کے گیارہ حروف بدل دیئے مثلاً سورۃ یونس کی بائیسویں آیت میں ہے کہ ینشرکم (یعنی یاء۔ نون اور شین) تو حجاج نے بدل کر یسیرکم (یعنی یاء۔ سین پھر یاء) بنا دیا (کتاب المصاحف طبع مصر ۱۹۳۶ء صفحہ ۴۹، صفحہ ۱۱۷)

اس روایت سے معلوم ہوا کہ حجاج سے پہلے ہی نقطے ڈالنے کا رواج تھا اور حجاج اسے بخوبی سمجھتا تھا کیونکہ اگر سابقہ (عثمانی) مصحف میں نقطے نہ ہوتے تو اسے کس طرح پتہ چلتا کہ یہاں ینشرکم ہے اسے یسیرکم بنا دینا چاہیئے۔؟ بالآخر اس تشابہ کو دور کرنے کی حضرت عثمانؓ نے نقاط کے بغیر تو کوئی صورت تجویز نہیں کی ہوگی۔ اور جب نقاط ڈالے تب ہی حجاج کا تغیر و تبدل سمجھ میں آ سکتا ہے۔ بہرحال یہ روایت بھی اس نظریہ کی تکذیب کرتی ہے کہ حجاج ہی کے حکم سے نقطے ایجاد ہوئے۔ وغیرہ۔

تاریخی شہادت ثبوت کے لحاظ سے وہی بات پختہ اور مدلل کہی جاسکتی ہے جو دعوے کے ساتھ اپنے اندر دلیل بھی رکھتی ہو۔ یہ بات کہ صحابہ کرامؓ نقطوں سے اچھی طرح واقف تھے اس کی تصدیق اس وثیقہ سے ہوسکتی ہے جو ۲۲ھ ہجری میں (عمر بن الخطاب (شہید ۲۳ھ) کے زمانے) ورق بردی پر یونانی اور عربی زبان میں لکھا گیا۔ یہ وثیقہ متلاشیان حق وصداقت اور شیدایان تاریخ کے لئے اطمینان اور تسکین کا موجب ہے کہ اس کے بعض حروف معجم و بانقط ہیں مثلاً۔ خاء۔ ذال۔ زاء۔ شین اور نون۔ اس وثیقہ کے عکس مع تعارفی نوٹ و ترجمہ کے لئے ملاحظہ ہو ڈاکٹر گراہمن کی کتاب

FROM THE WORLD OF ISLAMIC PAPYRI

Pt. II (x) P. 82, 113, 114

اس ضمن میں قرن اول کا ایک اور نقش جو حضرت امیر معاویہؓ (متوفی ۶۰ھ) کے عہد میں ۵۸ھ ہجری میں لکھا گیا تھا۔ بین ثبوت ہے اس بات کا کہ اس وقت نقطے ڈالنے کا عام رواج تھا کیونکہ حضرت معاویہؓ کی اس تحریر پر جو کہ طائف سے برآمد ہوئی ہے واضح طور پر نقطے لگے ہوئے ہیں اس کا عکس زیر ۱ ڈاکٹر جی، سی، مائلز کے مقالہ بعنوان EARLY ISLAMIC INSCRIPTIONS NEAR TAIF IN THE HIJAZ JENST(194-) پر ملاحظہ ہو

(بحوالہ مصادر الشعر الجاہلی ص۳۴)

لغت اور اشعار جاہلیت سے استدلال ابن السید بطلیوسی (متوفی ۱۱۲۷ء) لکھتے ہیں کہ

فاذا نقطته قلت وشمته وشما۔ ونقطته نقطا واعجمته اعجاما ورقمته ترقیما یعنی عرب نقط کے لئے وشم، عجم۔ نقط اور ترقیم کے الفاظ استعمال کرتے تھے مثلاً جب کہنا ہوتا کہ وشمته اعجمته اور رقمته تو اس سے مراد لیتے تھے نقطته یعنی یہ تینوں لفظ نقطے کے مترادف استعمال کئے جاتے تھے۔ ہوسکتا تھا کہ ابن السید بطلیوسی کی اس شہادت کو درخور اعتناء نہ سمجھا جاتا لیکن وہ اپنی تائید

میں جاہلیت کے تین بڑے شاعروں ابی ذویب (متوفی ۲۶ھ) مرقش بن سعد بن مالک حیری اور طرفہ بن العبد (مولود ۵۴۳ء ومقتول ۵۶۹ء) کے ابیات کو بھی پیش کرتا ہے۔ ابوذویب جو جاہلیت اور اسلام کا شاعر تھا کہتا ہے کہ ؎

برقم ووشم کما نمنمت بمشیمها المزدهاة الهدی

یعنی حمیری کاتب نے قرضے کی میعاد والے کاغذ کی تحریر پر نقطے ڈال کر ایسا مزین بنا دیا جیسے عروسہ کسی قیمتی ہدیہ کو سوزن کاری سے منقش بنا کر پیش کرتی ہے۔
مرقش کا بیت ہے ؎

الدار قفر والرسوم کما رقش فی ظهر الادیم قلم

یعنی خالی مکان کے نقوش د آثار ایسے نظر آرہے ہیں جیسے کسی نے ادیم (جاہلیت کا کاغذ) پر قلم سے نقطے ڈال دیئے ہوں۔ اور طرفہ کہتا ہے کہ

کسطور الرق رقشه بالضحی مرقش یشمه

یعنی دوپہر کے وقت کاغذ پر کسی لکھنے والے نے نقطے ڈال دیئے ہوں۔

(الاقتضاب بطلیوسی ص۹۳)

ہو سکتا تھا کہ ہم ابن السید بطلیوسی کی رائے کو عجلت اور جلد بازی پر محمول کرتے اور وشم، ترقم اور ترقیش کو صرف حسن خط سے تعبیر کرتے لیکن جب ہم دیکھتے ہیں کہ علامہ یوسف بن سلیمان ابوالحجاج عرف الاعلم الشنتمری (متوفی ۱۰۸۳ء) طرفہ مذکور کے بیت کی تشریح میں فرماتے ہیں کہ (قوله کسطور رق شبه رسوم الربع بسطور الکتاب ومعنی رقشه زینه وحسنه بالنقط۔
(دیوان طرفہ طبع یورپ ۱۹۰۰ء بمع شرح شنتمری ص۷۹) یعنی رقش کے معنے ہیں نقطوں سے خط کو مزین وخوبصورت بنانا۔

اس سے آگے چلئے تو علامہ ابوعلی اسماعیل بن القاسم بن غیدون عرف القالی بغدادی (متوفی ۳۵۶ھ/۹۶۷ء) کی تحقیق سے بھی یہی کچھ مستفاد ہوتا ہے۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں کہ (رقشت الکتاب رقشا ورقشته اذا کتبته ونقطته) میں نے کتاب کو مرقش کیا یعنی لکھا اور نقطے ڈالے (الامالی للقالی جلد ۲ ص۲۴۶

طبع مصر) اس کے بعد علامہ قالی نے بھی طرفہ کا وہی بیت پیش کیا جو اپنی تائید میں دیگر ائمہ اور اہل لسان پیش کرتے آئے۔

باِنقط اور بے نقط خط کے نام عرب جاہلیت والے خوبصورت و بانقط خط کو کئی ناموں سے یاد کرتے تھے مثلاً ترقیش، ترقیم، نمنمہ، وشم اور تنمیق (ملاحظہ ہو دیوان الہذلیین جلد اول ص۲۲، ص۶۵، المؤتلف والمختلف ص۲۷ دیوان حاتم الطائی ص۲۳، دیوان سلامہ بن جندل ص۱۵) یعنی خوبصورت خط کی علامت یہ ہوتی تھی کہ وہ بانقط ہوتا تھا۔ اور بدصورت خط کی علامت یہ ہوتی تھی کہ وہ بے نقط ہوتا تھا۔ چنانچہ ایسے خط کو "مشق" کہتے تھے۔ مشق کے معنی ہیں اتنی جلدی میں لکھا ہوا جس میں نقطوں کی پرواہ نہ کی گئی ہو۔ حضرت عمر بن الخطابؓ کا ارشاد ہے کہ بدترین خط "مشق" ہے (الصولی ادب الکاتب ص۵۶) ابن سیرین (متوفی ۱۱۰ھ/۷۲۸ء) کہتے تھے کہ قرآن مجید خط مشق میں لکھنا مکروہ ہے جب کہا گیا کہ کراہت کی وجہ کیا ہے! تو آپ نے فرمایا کہ یہ خط نقائص کا مجموعہ ہے تم دیکھتے نہیں کہ ادر تو اور الف جو کہ اپنی ہیئت کے لحاظ سے نمایاں ہوتا ہے اس کا بیڑہ بھی غرق ہو جاتا ہے۔
(المصاحف ص۱۳۳ طبع مصر) ابن السید بطلیوسی الاقتضاب (طبع ۱۹۰۱ء بیروت) میں لکھتے ہیں کہ انبار کے لوگ مہین اور بے نقاط خط کے عادی تھے (یعنی کچہری خط لکھتے تھے) اور حیرہ والے پختہ خط (یعنی بانقط) کو پسند کرتے تھے اور بعد میں وہی خط مصاحف کے لئے منتخب ہوا اور اہل شام جلی لکھتے تھے (ص۸۹) نیز لکھتے ہیں کہ جلدی اور کھینچ کر لکھنے میں خط کے کسی قاعدے اور قانون کا پاس نہیں رہتا جیسے خط مشق (کچہری) میں دیکھا گیا ہے۔

نقطے نہیں بھی لگائے جاتے تھے مضمون کی ابتدا میں جن دریافت شدہ نقوش و تحریرات کی نشاندہی کی گئی ہے ان کی تصویروں سے پتہ چلتا ہے کہ یہ لوگ نقطے نہیں بھی ڈالتے تھے۔
اب ذیل میں اس کی وجوہات ملاحظہ ہوں۔

(الف) یہ تحریریں اس وقت کی ہیں جب عربی زبان کو ابھی "مبین" کے امتیازی وصف سے نہیں نوازا گیا تھا اس وقت کی عربی نہ اتنی وسیع زبان تھی جس میں ہر موضوع پر اظہار خیال اور پھر بذریعہ تحریر اظہار مافی الضمیر کی گنجائش نکل آتی۔ اور جب تک کوئی زبان وسعت اختیار نہیں کرتی اس کے الفاظ بہت تھوڑے، جانے پہچانے اور محدود ہوتے ہیں۔ ایسے میں تشابہ کا اندیشہ کم رہتا تھا اور اگر رہتا بھی تھا تو اہل زبان سیاق وسباق سے لفظ کی صحیح پوزیشن اور مراد معلوم کر سکتے تھے۔

(ب) نقش نمارہ (۳۲۸ء) کے عکس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ نہایت تنگ اور گھنی سطروں میں لکھنے کے عادی تھے اور ایسے الفاظ کا انتخاب کرتے تھے جو اسماء، اعلام یا غیر متشابہ قسم کے ہوتے۔ ایسے میں اگر وہ نقطے ڈال دیتے تو قاری کے لئے ایک نئی الجھن یہ پیدا ہو جاتی کہ یہ نقطے کسی اوپر کے لفظ کے ہیں یا نچلی سطر کے کسی لفظ کے۔ اس فنی صعوبت سے بچنے کے لئے وہ یا تو بالنقط الفاظ کا انتخاب ہی نہیں کرتے تھے اور اگر کرتے بھی تھے تو آسان قسم کا تشابہ ہوتا تھا۔ (مصادر الشعر الجاہلی ۳۶) دراصل اہل زبان کے لئے بے نقاط الفاظ کا انتخاب کرنا اتنا دشوار نہیں جتنا ہم خیال کر رہے ہیں۔ فیضی نے غیر اہل زبان ہو کر بے نقاط تفسیر لکھنے کا مصمم ارادہ کر لیا اور وہ اس حد تک کامیاب رہا کہ خود اہل زبان بھی حیران رہ گئے۔ اب دیکھئے کہ ایک مقام پر اسے بڑی دشواری یہ پیش آئی کہ یوسف علیہ السلام کے تعارف میں ابن یعقوب لکھنا تھا مگر ابن یعقوب کے تمام تر معجم وبالنقط حروف تھے لہٰذا اس سے بچنے کے لئے قطع نظر ادبی کے اس نے "ولد الاعمیٰ" لکھ دیا۔ پس جب ایک اجنبی زبان کا اہل علم کوشش کر کے بے نقاط الفاظ تلاش کر سکتا ہے تو کیا اہل زبان اس پر قادر نہیں تھے؟

(ج) ایک زمانے میں یہ رواج پڑ گیا تھا کہ بانقاط وبے نقاط تمام کلمات کو بے نقاط ہی لکھا جائے تاکہ قاری کی عقل کا امتحان ہو اور وہ اس معمہ کو خود

ہی حل کرے۔ چنانچہ یہ رواج اس قدر زور پکڑ گیا کہ، عقلاء امراء اور علماء کے باہمی مکاتبات میں اگر نقطے ڈال دیئے جاتے تو اسے صریح توہین اور دوسرے کی بے عزتی تصور کیا جاتا۔ یعنی مرسل الیہ یہ سمجھتا کہ مرسل نے اسے غبی یا جاہل تصور کر لیا ہے تاہم اس دور میں بھی عوام کے لئے بانقط تحریر کا تھوڑا بہت رواج تھا۔ اس کی پوری تفصیل امام ابوبکر صولی لغوی (متوفی ۳۳۶ھ) کی ادب الکاتب طبع سلفیہ ۱۳۴۱ مصر ص ۵۷ ، ۵۸) پر ملاحظہ ہو۔

اختلافات قرآت کا پس منظر۔ تاریخ اور ماخذ

از جناب رحمت اللہ طارق فاضل حدیث مکہ مکرمہ

مودودی صاحب نے اپنی تفسیر اور دیگر تصانیف میں متعدد مقامات پر اختلاف قرأت کو ثابت کیا ہے اور اس نظریے کے مخالفین پر ایک گونہ طنز کیا ہے۔ حال ہی میں انہوں نے (جون ۱۹۵۹ء کے ترجمان القرآن میں) اسی موضوع پر اپنے خیالات کو یکجا کر کے جامع صورت میں پیش کیا ہے اور گویا اپنے موقف کو واضح صورت دے دی ہے۔

یوں تو مودودی صاحب کے علمی مقام سے سب آگاہ ہیں لیکن مذکورہ مقالہ میں انہوں نے جو انداز بیان اختیار کیا ہے اور اپنے موقف کو ثابت کرنے کے لئے جو طرز استدلال منتخب فرمایا ہے اس سے وہ کسی بھی حق کی جستجو رکھنے والے کو مطمئن نہیں کرسکے۔ جہاں تک اس مسئلے میں شکوک وشبہات پیدا ہونے کا تعلق ہے وہ تو اس مقالے سے پہلے بھی موجود تھے۔ کیونکہ جو بات عصمت قرآن کے قطعاً منافی ہو اس بات کو تسلیم کرلینے میں ہر اس سلیم العقل آدمی کو پس وپیش ہوگا جو قرآن کی ازلی وابدی صداقت اور پھر حفاظت وعصمت پر یقین رکھتا ہے اور جس کا ایمان ہو کہ قرآن جس طرح سے رسول عربی پر نازل ہوا تھا بعینہ اسی طرح اب ہمارے پاس موجود ہے اس کے مطالب میں کوئی تبدیلی تو کیا ہوتی ہے اس کے فقروں، الفاظ اور حرکات کی ترتیب بھی وہی ہے کیونکہ اگر ہم ایسا تسلیم نہ کریں تو قرآن کے بہت سے دعوؤں کی تکذیب لازم آتی ہے۔

لو كان من عند غیرالله لوجدوا فيه اختلافاً كثيراً ○
(القرآن) ۴ : ۸۲

یعنی قرآن اگر غیراللہ کا کلام ہوتا تو اس میں بہت سا اختلاف پایا جاتا۔

ظاہر ہے کہ اس "اختلاف" میں صرف مطالب ومفاہیم کا اختلاف ہی نہیں بلکہ الفاظ وقرآت کا اختلاف بھی شامل ہے۔اس قرآنی دعویٰ کی روشنی میں تو صرف یہی کہا جاسکتا ہے کہ قرآن اگر مفہوم کے اختلاف وتضاد سے پاک ہے تو قرآتوں کے اختلاف سے بھی پاک ہے۔ اس کے علاوہ اللہ تعالیٰ نے خود اس کتاب کی حفاظت کا اعلان کیا ہے۔ انا نحن نزلنا الذكر و انا له لحافظون ○ (۱۵ : ۹)

اگر اس عظیم الشان دعویٰ کے باوجود بھی قرآن میں قرآتوں کے اختلاف کو تسلیم کرلیا جاتا ہے تو پھر آخر قرآن کی صداقت کا معیار کیا رہ جاتا ہے؟

اس سلسلے میں ہمارے علماء کی مساعی بھی ہیں اور انہوں نے اپنا فرض اسی کو گردانا ہے کہ زیادہ سے زیادہ دلائل سے اس خیال کی توثیق کی جائے۔ راقم السطور نے زمانہ طالب علمی میں اس خیال کے بارے میں عدم اطمینان کا اظہار کیا تو اساتذہ نے یہ کہہ کر چپ کرادیا کہ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں آپ ہی کے فرمان کے مطابق آیات قرآن کو مختلف الفاظ اور قرآتوں سے تلاوت کیا جاتا تھا۔ (ملاحظہ ہو طبری جلد اول صفحہ ۱۵ النشر فی القرآت العشر جلد ۱ صفحہ ۱۹ طبع مصر۔ تاویل شکل القرآن ابن قتیبہ صفحہ ۲۶ طبع مصر)

راقم کے مشرق وسطیٰ کے سفر کے محرکات میں ایک یہ بھی تھا کہ اس خیال (اختلاف قرأت) کی اصل کا کھوج لگایا جائے۔ میرے ناتواں شانوں پر بیت اللہ کی قدیم لائبریری اور دمشق کے کتب خانہ "ظاہریہ" کا بہت بڑا احسان ہے کہ ان عظیم علمی ذخیروں نے ایک حق وصداقت کی تلاش کرنے والے کی صحیح راہنمائی کی۔ بالآخر اس صداقت نے ظہور کیا کہ اختلاف قرأت کے افسانوں کے پیچھے بہت سارے تاریخی عوامل کار فرما ہیں اور آگے چل کر انہی عوامل نے تمام علوم قرآنی کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لیا۔

تاریخ نے نظریات وشخصیات کے ساتھ ہمیشہ یہ بے انصافی روا رکھی ہے کہ مصنوعی اور وضعی خیالات وعقائد کی رنگ آمیزیوں سے اصل حقیقت کو عوام الناس کی نگاہوں سے چھپادیا ہے۔ خلفائے ثلاثہ کے بعد اسلام کی تاریخ میں جس فکری اور عملی انتشار کا سراغ ملتا ہے اس کے پس منظر میں بہت سے ایسے ہاتھ کارفرما تھے جن کی نشاندہی واضح طور پر نہیں کی جاسکتی۔ اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ خاندان نبوت سے متعلق لوگ نسل پرستی کے زیر اثر اپنے تئیں خلافت کا زیادہ حقدار سمجھتے تھے لیکن وقتی موانعات اس راہ میں رکاوٹ بن گئے۔ حضرت علیؓ اور حضرت معاویہؓ کی آویزش میں اس تحت الشعوری خیال نے واضح اور شعوری حیثیت اختیار کرلی۔ چنانچہ تاریخ کے اسی موڑ پر پہنچ کر عامہ المسلمین کے ایک حصے نے اسلام کے بنیادی عقائد میں "خلافت" کو بھی لازمی عنصر قرار دے دیا اس گروہ کا خیال تھا کہ خلافت جیسے اہم معاملے کو امت کی صوابدید پر نہیں چھوڑا جاسکتا اور خلافت نہ صرف منصوص بلکہ

ورثے کی بنیاد پر ہونی چاہئیے۔ بناء علیٰ ہذا مسلمانوں کے اس گروہ نے علیؓ کو وصی رسولؐ گردانا اور اس نظریے کو فروغ دیا کہ جس طرح رسولؐ مامور من اللہ ہے اسی طرح اس کا جانشین بھی کم از کم مامور من الرسولؐ ہونا چاہئیے۔ ہوسکتا ہے کہ یہ غیر فطری خیال کچھ عرصے کے بعد دب جاتا کیونکہ خلافت رسول اللہ کے خاندان میں ہو یا اس سے باہر مسلمانوں کے سوادا عظم نے کسی وقت بھی اسے جزو ایمان قرار نہیں دیا لیکن جب خلافت مکمل طور پر بنو امیہ کے سپرد ہوگئی اور اسلامی حکومت کی بنیادیں مضبوط ہونے لگیں تو ان عناصر نے جو وقتی طور پر حالات سے شکست کھا گئے تھے خلافت کے نظریے کو ایک سیاسی حربے کے طور پر استعمال کرنا شروع کردیا اور ایسا کرنا ان کا فطری حق تھا کیونکہ سیاسی اقتدار سے محرومی ایک ایسا زخم تھا جس کا مداوا کسی طرح نہیں ہوسکتا تھا اب اقتدار کی دوسری راہیں کھلی نہ دیکھ کر اس گروہ نے افکار کی دنیا پر شب خون مارا۔ عقائد میں تصرف ہوا تو عقائد کی تفسیر و تعبیر میں بھی تصرف ہونا لازمی تھا۔ چنانچہ عقائد کی ترجمانی کے ضمن میں اس گروہ نے اسلامی نصاب تعلیم میں ایسی غیر عقلی تبدیلیاں کیں کہ الامان والحفیظ ۔۔ اور پھر یہ ایک حقیقت ہے کہ احوال وظروف کا دھارا ہمیشہ یک رخا نہیں بہتا مگر لٹریچر وہ زندہ و پائندہ شے ہے جسے کوئی مٹا نہیں سکتا۔

قرآن کی جمع وتدوین کا عظیم کام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مبارک ہاتھوں تکمیل پذیر ہوچکا تھا (اتقان صفحہ ۱۴۵ طبع مصر) دین مکمل ہوچکا تھا۔ کتاب مدون ہوچکی تھی۔ سورتوں کی ترتیب، آیات کے محل وقوع، زیر، زبر وغیرہ سیدالبشر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے

مبارک عہد میں خود آپ کی نگرانی میں حیطہ تحریر میں لائے جاچکے تھے
(اتقان صفحہ ۱۴۴ -- ۱۴۸) اختلاف کے رخنے ڈالنے کی سب راہیں مسدود
ہو چکی تھیں۔ قرآن کو الہی الواح میں " محفوظ " کے امتیازی لقب سے
موسوم کیا جاچکا تھا (بروج ۲۲) اب بجز اس کے کہ تعبیر کا ایک ایسا
متوازی نظام قائم کردیا جائے جو فی نفسہ متضاد اور متناقض ہو۔ مقصود
یہ کہ تعبیر اور تفسیر کا تضاد اصل حقیقت کو مشکوک کردے۔ چنانچہ اس
سلسلے میں جہاں اور بہت سے اقدام کئے گئے وہاں قرآن سے بھی صرف نظر
نہیں کیا گیا کہ درحقیقت اسلام کی اصلی قرآن ہی ہے۔

قرآن کے بارے میں اس حقیقت سے کون انکار کرسکتا ہے کہ اس
میں سادہ ترین زبان میں سادہ ترین حقائق اور صداقتوں کا بیان ہے۔
اہل زبان اظہار مافی الضمیر کے لئے جس اسلوب بیان، جس طرز نگارش،
جس ایجاز واختصار ، اشارہ وکنایہ، ندرت بیان ، صنائع وبدائع لفظی
ومعنوی اور ضرب الامثال اور جس طریق فہمائش اور انداز تخاطب کو
اختیار کرسکتے ہیں۔ قرآن مجید نے بھی الہامی مطالب کو ذہن نشین کرانے
کے لئے ان تمام اصناف سخن کا التزام کیا ہے یہی وجہ ہے کہ عقائد سے
قطع نظر کرتے ہوئے قرآن کو ادب عالیہ میں سب سے بلند مقام دینے پر
تقریباً تمام اہل ادیان متفق ہیں۔ اس کا اسلوب بیان سادہ لیکن دل
نشین ہے۔ فقرے مختصر لیکن مطالب پر حاوی۔ پیرا ہائے بیان مختلف
لیکن ترجمانی حقیقت واحدہ کی، صداقت وہدایت کے تمام اصولوں کا منبع
انسانیت کے بنیادی قوانین کا سرچشمہ لسانیات میں لفظی تراکیب اور
اصول انشا کا ماخذ۔ بقول کسے

جمیع العلم فی القرآن لکن
تقاصر عنه افہام الرجال

"یعنی تمام علوم کا سرچشمہ تو قرآن ہی ہے یہ ہمارے شعور اور ادراک کی نارسائی ہے کہ ہم ان تک نہیں پہنچ سکتے۔"

بہرحال یہ ایک حقیقت ہے کہ قرآن میں حقیقی و مجازی الفاظ سے لے کر متشابہ و محکم قسم کے کلمات یعنی انشاء وادب کے تمام مدارج کا خیال رکھا گیا ہے۔ چنانچہ قرآن مجید کے انہیں اوصاف کو آڑ بنا کر طبع زاد تعبیرات و تفسیر کا ایک نظام قائم کیا گیا ہے اور خدمت قرآن کے نام پر بے شمار علوم قرآنی کا سلسلہ وجود پذیر ہوگیا اور علوم قرآنی کو ذیل کے اصناف میں تقسیم کیا گیا۔ لغات القرآن، تفسیر القرآن، اعراب القرآن، بدائع القرآن، نوادر القرآن، قصص القرآن، اسرار القرآن، احکام القرآن خواص القرآن، امثال القرآن، متشابہ القرآن، اور مجاز القرآن وغیرہ وغیرہ۔ سیوطی (متوفی ۱۵۰۵م) نے ایسے علوم کے اسی انواع شمار کئے ہیں۔ قرآن کی ترجمانی کا یہ سارا کام بہت ہی مستحسن اور قابل عزت ولائق صد تکریم ہے لیکن جب ہم تاریخی حقائق کی روشنی میں اصل محرکات کا کھوج لگاتے ہیں تو حقیقت کچھ اور ہی معلوم ہوتی ہے۔ اس لئے سیاسی مصلحتیں اس سارے عمل میں پس منظر کا کام کررہی تھیں۔ ان سے صرف نظر نہیں کیا جاسکتا اس کا مطلب یہ نہیں کہ مسلمانوں کو یہ مشورہ دیا جارہا ہے کہ سرے سے ہی علوم قرآنی سے مستغنی و بدظن ہوجائیں۔ مقصود گفتگو یہ ثابت کرنا ہے کہ علوم قرآن اور اختلاف قرأت کے نظریے کا انحصار جن جن روایات پر ہے ان سب کے راوی یا ان

سے استناد کرنے والے اسی گروہ سے تعلق رکھتے ہیں جن کی سیاسی محرومیاں ان کو ہر وقت طالع آزمائی پر مجبور کرتی رہتی تھیں۔ یہاں اس بات کا ذکر کر دینا بھی نامناسب نہیں کہ اس گفتگو میں روئے سخن کسی خاص گروپ یا فرقے کی طرف نہیں بلکہ اس سے مقصود چند حقائق کا برملا اظہار ہے۔ ان علوم کے اولین مصنفوں یا ان سیاسی نامرادوں کے افکار و نظریات نے آگے چل کر ہمارے پورے اسلامی اور تفسیری ڈھانچے کو اس قدر مفلوج کر دیا کہ بعد میں آنے والے بڑے سے بڑے علماء بھی اس غلط فہمی کا شکار ہوگئے کہ ہو نہ ہو ان افکار و نظریات کی ضرور کوئی بنیاد ہوگی۔ مثلاً اختلاف قرأت کا فتنہ ہی لے لیجئیے جس کا مودودی صاحب جیسا شخص نہ صرف معترف اور معتقد ہے بلکہ سرگرم مبلغ اور پرجوش ناشر بھی ہے۔ اختلاف قرأت کے جواز میں مودودی صاحب وضاحت فرماتے ہیں کہ۔

" مختلف قرآتوں کو رد یا قبول کرنے کے لئے اہل فن کے درمیان جن شرائط پر قریب قریب مکمل اتفاق پایا جاتا ہے وہ یہ ہیں - اول یہ کہ جو قرأت بھی ہو وہ مصحف عثمانی کے رسم الخط سے مطابق رکھتی ہو اس رسم الخط میں جس قرأت کی گنجائش نہ ہو وہ کسی حال میں قبول نہیں کی جائے گی مثلاً مصحف عثمانی میں اگر ایک لفظ " بعد " لکھا گیا ہے تو اس کی قرأت بعُدَ اور بَعَّدَ تو قبول کی جاسکتی ہے مگر بعدت قبول نہیں کی جاسکتی۔ دوم یہ کہ یہ قرأت ایسی ہو جو لغت، محاورے اور قواعد زبان کے خلاف نہ ہو اور عبارت کے سیاق وسباق سے مناسبت رکھتی ہو۔

(ترجمان القرآن جون ۱۹۵۹ء، صفحہ ۵۱)

مودودی صاحب کا ارشاد کسی وضاحت کا محتاج نہیں یعنی آپ فرما رہے ہیں کہ کسی قرأت کے صحیح ہونے کے لئے عثمانی رسم الخط سے مطابقت ضروری ہے۔ اس سے صیغہ امر کا بن جائے تو اور ماضی کے مفہوم میں تبدیل ہوجائے تو کوئی حرج نہیں ہے۔ مثلاً بٰعِدۡ کا لفظ جو خاص انشا اور امر کے لئے قرآن مجید میں واقع ہوا ہے اسے اگر بَعَّدَ پڑھ کر انشاء سے خبر میں اور امر سے ماضی میں تبدیل کردیا جائے تو اصول اول کے لحاظ سے مودودی صاحب کے نزدیک قرآن ہی ٹھہرے گا۔ حالانکہ یہ بدیہی بات ہے کہ امر اور ماضی اپنے اپنے مدلول اور مفہوم کے بلحاظ قطعاً مختلف اور متضاد ہیں۔ پھر تعجب ہے کہ بَعَّدَ کی قرأت جسے مودودی صاحب مشہور اور متواتر قرار دے رہے ہیں۔ متقدمین نے اسے غیر مشہور اور غیر متواتر بلکہ خود ساختہ یا شاذ قرار دیا ہے۔ (ملاحظہ ہو القرأت الشاذۃ صفحہ ۱۲۱ طبع مصر، تفسیر بحرالمحیط جلد ہفتم صفحہ ۲۷۳)

اب اصول دوم ملاحظہ ہو جس سے مترشح ہوتا ہے کہ لغت، محاورے اور عبارت کے سیاق وسباق سے اگر مناسبت پائی جائے تو وہاں بھی قرأت میں اختلاف جائز ہے مثلاً اگر الحمد للہ رب العالمین (باء کی زیر کے ساتھ پڑھنے کی بجائے) باء کی زبر کے ساتھ پڑھا جائے تو کوئی باک نہیں کیونکہ اصول دوم کے مشمولات کے عین مطابق ہے اور رسم الخط میں متجالست (ہم جنسی) مستزاد۔ یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ مختلف قرأتیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تعلیم فرمائی تھیں یا قاریوں کی دست اندازی سے وجود پذیر ہوئیں؟ اس کے جواب میں مودودی صاحب فرماتے ہیں کہ " فی الواقع حضور ہی نے بعض الفاظ

مختلف طریقوں سے پڑھے اور پڑھائے ہیں اور ان مختلف قراتوں میں درحقیقت تضاد نہیں ہے بلکہ غور کرنے سے ان میں بڑی گہری معنوی مناسبت اور افادیت پائی جاتی ہے۔" (ترجمان القرآن جون ۱۹۵۹، صفحہ ۵۲ سطر ۷ تا ۹)

لیکن یہ فرمایا جائے کہ اس بے بنیاد مفروضہ کے بعد یہ فیصلہ کیونکر ہوگا کہ جو قرآن ہمارے پاس موجود ہے وہ من وعن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا دیا ہوا ہے۔۔۔؟ اب آپ گہری مناسبت اور عدم تضاد کا نمونہ ملاحظہ فرمالیں۔

(۱) او یکون لک بیت من زخرف (اسرآء ۹۳) کو
بیت من ذهب (قرآت مجاہد کی متوفی ۱۰۲م، طبری جلد دہم صفحہ ۱۰۲)

(۲) بیضآء لذة للشاربین (صافات ۴۶) کو صفرآء لذة للشاربین (۳) ان الیاس لمن المرسلین (صافات ۱۲۳) اور وسلام علی الیاسین (صافات ۱۳۰) کو ان ادراس لمن المرسلین - اور - ادریس لمن المرسلین - وسلام علی ادریسین (طبری جلد ۲۳ صفحہ ۳۱، ۵٦، احیاء غزالی جلد ۱ صفحه ۲۷٦)

اب مودودی صاحب فرمائیں کہ بیضآء (سفید) اور صفرآء (پیلے) میں کیا معنوی مناسبت ہے؟ اور الیاس اور ادریس میں عدم تضاد کی کون سی نوع ہے؟ مودودی صاحب طے شدہ مفہوم کی عقلی دلائل سے پشتیبانی کرتے ہوئے یہ ذہن نشین فرمانا چاہتے ہیں کہ " عقل بھی کہتی ہے کہ جبرئیل نے (مالک اور ملک یوم الدین) دونوں قراتوں کے ساتھ یہ لفظ

حضور کو سکھایا ہوگا (ہوگا قابل غور ہے) اور حضور اس لفظ کو کبھی ایک طرح اور کبھی دوسری طرح پڑھتے ہوں گے۔ (ہوں گے ملاحظہ ہو)" (سطر ۱۵ تا ۱۷)

یعنی اس طرح مودودی صاحب یہ باور کرانا چاہتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جبرئیل اور حضرت باری تعالیٰ نے ان متضاد المفہوم قراتوں کا خود ہی حکم دیا ہوا ہے لیکن جب حقیقت الامر اسی طرح تھی تو پھر ہوگا اور ہوں گے کے فرضی اور قیاسی الفاظ سے اتنے عظیم نظریے کو تقویت پہنچانا اہل علم کو زیب نہیں دیتا۔ اس سے تو معلوم ہوتا ہے کہ آنجناب ابھی تک اس معاملے میں ظن و تخمین کی وادی کی سیاحت فرما رہے ہیں۔ بہرحال حضرت ہم آپ کو کس طرح باور کرائیں کہ "اجماع امت" اور "خبر متواتر" کا سہارا ہمیشہ انہی لوگوں نے لیا ہے جن کے علم وبصیرت میں گہرائی نہیں تھی اور جن پر اپنے استدلال کی خامیاں واضح اور استنباط کی کمزوریاں عیاں تھیں اور جن کا یقین تھا کہ ایسے حضرات اجماع امت اور خبر متواتر کا اسراف کئے بغیر اپنا مطلب نہیں نکال سکتے۔ اجماع امت میں دین بننے کی صلاحیت ہے؟ یہ کہیں واقع ہوا بھی ہے؟ کتنے مسائل ہیں جن پر حقیقی اجماع ہوا ہے؟ فرد واحد کے اختلاف سے اجماع کی پوزیشن کیا رہ جاتی ہے؟ یہ اور اس قسم کے دیگر سوالات کو حل کئے بغیر اجماع امت کا بے جا استعمال علمی دنیا میں کوئی وقعت نہیں رکھتا۔ مشورۃً عرض کروں گا کہ اجماع امت کے ضمن میں قاضی شوکانی کی شہرہ آفاق کتاب ارشاد الفحول صفحہ ۶۳ تا ۸۰، ملاحظہ فرمائیے گا۔

اسی طرح قرآن کے باہر خبر متواتر کا وجود قلیل ونادر ہے اس کا سہارا لینا یا تواتر کے ایسے معنی کرنا جس سے سلف صالحین آشنا نہیں تھے سراسر مہذب دھونس ہے۔ ہم مانتے ہیں کہ مالک اور ملک کی طرح ارجلکم کی دوسری قرأت بھی متواتر ہے کیونکہ آپ کا ارشاد ایسا ہے اور آپ کا ارشاد بجا! لیکن بخدا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی طرف سے کسی بھی آیت کریمہ کے الفاظ کو دو یا دو سے زائد قرأتوں سے نہ تو تلاوت فرمایا ہے اور نہ ہی ایک ہی لفظ کے ایک ہی مقام پر دو متضاد مفہوم متعین فرمائے ہیں۔ اس نبی اکبر واعظم اس ذات اقدس واکرم کی طرف ایسی بات کی نسبت کرنا وہ جسارت ہے جس کا ارتکاب ایک مؤمن صادق کے لئے ہرگز مناسب نہیں ہے۔

ہاں تو آپ فرما رہے تھے کہ ارجلکم (لام کے زبر۔ فتحہ) اور ارجلکم لام کی زیر کسرہ) کے ساتھ دونوں متواتر اور مشہور قرأتیں ہیں اور ان کے مفہوم میں کوئی تضاد نہیں ہے یعنی بقول آپ کے بے وضو آدمی کو وضو کرنا ہو تو اسے پاؤں دھونا چاہئیے باوضو اگر تجدید وضو کرے تو وہ صرف مسح پر اکتفا کرے۔ (ترجمان صفحہ ۵۳ سطر ۳) کاش۔ یہی نکتہ اگر سنی حضرات کے دماغ میں آجاتا اور یہی توجیہ شیعہ اخوان کو سوجھتی جو آپ پر منکشف ہوئی تو یقیناً تیرہ سو سال کا جھگڑا کبھی کا نپٹ گیا ہوتا۔

مودودی صاحب آپ تو فروری ۵۹ ۔ کے ترجمان القرآن میں اپنی اس تحقیق کے برعکس فرما چکے ہیں کہ "پاؤں کا دھونا ہی صحیح ہے کیونکہ احادیث اور عقل اسی خیال کے مؤید ہے اور جو صحابہؓ ارجلکم (لام مکسور کی متواتر قرأت کے مطابق صرف مسح کرتے تھے ان کی یہ اپنی رائے تھی

(ترجمان فروری صفحہ ۵۲ سطر ۲۰)

سوال یہ ہے کہ جب ایک قرأت متواتر ہے تو اس کا علم صرف دو تین صحابہ تک کیوں محدود رہا؟ اور پھر جب وہ ایک متواتر قرأت سے پاؤں کا مسح کرنا ہی اخذ کررہے ہیں تو انہیں تنہا اپنی رائے کا متبع کیونکر کہا جارہا ہے؟ کھلی ہوئی بات ہے کہ مودودی صاحب اختلاف قرأت میں معنوی مناسبت اور گہرے ربط کے قائل ہیں ۔ خاص کر زبر، زیر اور الفاظ کے اختلاف کو آپ چنداں مضر خیال نہیں فرماتے مثلاً اھدنا صراط المستقیم اور ارشدنا الصراط المستقیم میں یا اذا ضربتم فی سبیل فتبینوا اور فثبتوا - یا بل عجبت- (تا پر زبر) اور عجبت (تا پر پیش) میں- آپ کے نزدیک کوئی فرق نہیں ہے ۔ حالانکہ قرآن نے جب فرمایا ہے کہ یہاں فتبینوا (لنساء ۹۴) ہے تو حمزہ کسائی خلف، حسن اور اعمش قاری کو کیا حق پہنچتا ہے کہ وہ اسے بدل کر فثبتوا بنادیں؟ کتاب الدیات ابو عاصم النبیل متوفی ۹۰۶ م صفحہ ۱۴، ۱۵ طبع قاہرہ ۱۳۲۳ھ)

اب ہم بتائیں گے کہ اختلافات قرآت کے موضوع پر سب سے پہلے کس نے لکھا؟ کیونکہ اس کے بغیر ہمارا یہ دعویٰ بے دلیل رہ جائے گا کہ سیاسی محروموں نے تعبیر کا ایک ایسا متوازی نظام قائم کردیا جس نے اصل حقیقت کو مشکوک کرکے اسلام اور قرآن کا ڈھانچا ہی تبدیل کردیا۔

اختلافات قرأت کا پہلا مصنف

مشہور ہے کہ اس موضوع پر سب سے پہلے ابو عبیدہ قاسم بن سلام (متوفی ۸۳۱ م) نے "کتاب القرآت" کے نام سے ایک تصنیف یادگار

چھوڑی ہے۔ لیکن تاریخی شواہد اور مستند لٹریچر کے مطالعہ سے واضح ہوجاتا ہے کہ اس عنوان اور موضوع پر سب سے پہلے شیعی محدث ابان بن تغلب (متوفی ۷۵۸ م) نے ابوعبیدہ سے ستر اسی سال پہلے لکھا اور پھر یکے بعد دیگرے ذیل کے شیعہ اہل علم نے اس موضوع پر طبع آزمائی کی۔ (۱) سعد بن ابو جعفر بن محمد بن سعدان عرف ضریر (متوفی ۸۴۵ م) (۲) محمد بن حسن ابن ابی سارہ عرف ابو جعفر رواسی کوفی (۷۹۶ م) استاذ فراد کسائی اور یہ معلوم ہے کہ رواسی کا طریقہ قرأت بھی مستقل ہی تھا۔ علاوہ (۳) حمزہ بن حبیب زیات کوفی شیعی نے بھی کتاب القرأت نامی کتاب لکھی ہے جس کا ابھی ابھی تعارف عرض کروں گا۔

ان شواہد سے معلوم ہوا کہ تضاد قرأت کے عنوان اور موضوع پر قرون اولیٰ میں صرف شیعہ اہل علم ہی نے لکھا اور دوسرے لفظوں میں قرآنی تسوید وتوفیق کے وہی مجاز کل تھے۔

حمزہ زیات

مودودی صاحب قرآن کے ضمن میں جس سند کو قابل اعتماد سمجھتے ہیں وہ آپ کے نزدیک وہی ہے جس میں حمزہ بن حبیب زیات واقع ہے بلکہ آپ ابن زیات کے سلسلہ سند کو خاص فرماکر تحریر فرماتے ہیں کہ حمزہ عن الاعمش، عن یحیٰ بن وثاب، عن زر بن جیش، عن علی وعثمان وابن مسعود (ترجمان جون ۵۹۔ صفحہ ۵۰ سطر ۵، ۶)

اب اس خاص سلسلہ سند کا حال بھی سن لیجئے۔

(۱) حمزہ بن حبیب زیات (متوفی ۷۷۳ م) بہ تحقیق علامہ طوسی شیعی

(متوفی ۱۰۶۸م) خالص شیعہ تھے۔ امام ازری، امام ساجی، یزید بن ہارون عبدالرحمن بن مہدی، امام احمد بن حنبل ، سلیمان بن ابی شیخ اور احمد بن سنان جیسے ائمہ رجال کو حمزہ مذکور کی قرأتوں پر سخت اعتراضات تھے اور لوگوں کو اس کے قرآن سے بچنے کی تلقین کرتے اور کہتے تھے کہ اس کی قرأت لغو ہے۔ امام ابوبکر بن عیاش ، حماد بن زید اور یزید بن ہارون اس کی قرأت کو قواعد عرب کے خلاف جانتے اور اس کے مطابق قرأت کرنا بدعت سمجھتے اور لوگوں کو اس کی اقتداء میں ادا کردہ نمازوں کے اعادہ کا حکم دیتے تھے۔ (ملاحظہ ہو میزان الاعتدال وغیرہ) اتنی واضح جرح کی موجودگی میں بھی مودودی صاحب اگر قرآن کے معاملہ میں حمزہ کو امین سمجھتے ہیں تو یہ آپ کی ایسی خوش فہمی ہے جس کا ہم گنہگار کوئی جواز مہیا نہیں کر سکتے۔

(۲) سند کے دوسرے خاص راوی سلیمان بن مہران عرف (اعمش اسدی متوفی ۷۶۴م) کوفی بڑے پائے کے محدث اور عالم تھے لیکن تمام اوصاف حسنہ کے باوجود محدثین نے اسے فاسد یا حالک فی الحدیث (حدیث کو تباہ وبرباد کرنے والا) یعنی دبے الفاظ میں کذاب کا سرٹیفکیٹ عطا کیا ہے علاوہ یہ بڑے راسخ العقیدہ شیعہ بھی تھے ملاحظہ ہو کتاب المعارف ابن قتیبہ صفحہ ۲۰۶ طبع مصر یا تنقیح المقال علامہ مامقامنی جلد دوم صفحہ ۶۵ تا ۶۶ طبع نجف سائز کلاں) جب وہ حدیث میں کذاب تھے تو اس کے ذریعہ جو قرآن ہمارے پاس پہنچا وہ یقیناً ایک خاص سند ہی کا معجزہ ہے۔

(۳) سند کے تیسرے راوی یحییٰ بن وثاب اسدی کوفی متوفی (۲۰ ۷

م) کوفہ کے محلہ بنی اسد کے کبار شیعہ میں سے تھے (ملاحظہ ہو کتاب المعارف صفحہ ۲۳۰، لنقد رجال علامہ تفرشی مطبوعہ طہران صفحہ ۳۷۶ تنقیح المقابل جلد سوم صفحہ ۳۲۲)

(۴) سند کے چوتھے خاص راوی امام زر بن جیش ابوالحریم اسدی کوفی (متوفی ۶۷۰م ، ۵۲ ھ) سیاسی اور مذہبی طور پر حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے خاص الخاص حمایتی اور شیعہ تھے تاہم اہل سنت نے آپ سے بہت کچھ حاصل کیا ہے (تنقیح المقال فی احوال الرجال جلد اول صفحہ ۴۳۸ طبع ۱۳۴۹ھ ، لنقد الرجال علامہ تفرشی صفحہ ۱۳۶ طبع طہران) یہ تھا حمزہ کا خاص الخاص اور صحیح ترین سلسلہ قرآت جسے ہمارے اکابر اور حضرت مولانا بڑے وثوق سے قابل تمسک سمجھتے آرہے ہیں!!

ایک وضاحت

اختلاف قرآت کے ضمن میں ہم یہ عرض کرنا بھول گئے کہ بعض حضرات معصومانہ انداز سے یہ کہہ کر مطمئن ہوجاتے ہیں کہ یہ مختلف قرأتیں صرف قرن اول میں تلاوت کی جاتی تھیں جوکہ بعد میں آہستہ آہستہ متروک ہوتی چلی گئیں اور ان کا کتب تفاسیر میں موجود ہونا یا ان کی بنیاد پر مسائل کا اختلاف معلوم کرنا مضر نہیں ہے ؟ ایسے حضرات کی خدمت میں التماس ہے کہ اگر قرن اول ہی میں ان کی تلاوت کی جاتی اور مسائل میں ان کے مفہوم کے مطابق اخذ و استنباط کیا جاتا تھا تو آج کونسی وجہ مانع ہے کہ آپ زبان سے تو ان قرآتوں کو ضروری نہ سمجھیں مگر عملی طور پر آپ کے نزدیک وہی متروک قرأتیں اصل قرآن پر بھی فوقیت

رکھیں، حقیقت یہ ہے کہ امام ابن تیمیہ (متوفی ۱۳۲۸م) غیر مبہم الفاظ میں تصریح فرما چکے ہیں کہ موجودہ قرآن کے علاوہ جتنی قرأتیں بھی ہیں وہ احکام شرع میں ہر وقت قابل اعتبار ہیں فرماتے ہیں کہ غیر عثمانی قرأتوں کا اعتبار اس وقت اور بھی ضروری ہو جاتا ہے جب کہ ان تمام قرأتوں کا تعلق شریعت اور احکام سے ہو۔ (رفع الملام مطبوعہ آداب پریس قاہرہ ۱۳۱۸ھ، صفحہ ۴۱) امام ابو شامہ (متوفی ۱۲۶۸م) تو منکرین اختلاف قرآت سے اس قدر خفا ہیں کہ قطعی گمراہ کہنے میں بھی کوئی باک محسوس نہیں کرتے۔ بہرحال

فکر ہر کس بقدر ہمت اوست

اعراب القرآن

اعراب کے معنی ہیں الفاظ پر زیر، زبر اور پیش لگانا۔ سلف صالحین کا تو یہ عقیدہ تھا اور ہر مسلمان کا یہی عقیدہ ہونا چاہیئے کہ یہ بنیادی اور عظیم کام خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سرانجام دے گئے تھے بلکہ آپؐ نے حکم دیا تھا کہ اعربو القرآن یعنی قرآن پر اعراب لگاؤ (بیہقی، ابو یعلی بحوالہ مشکوۃ صفحہ ۱۸۰) جامع صغیر جلد ۱ صفحہ ۳۸، منتخب کنزالعمال جلد ۱ صفحہ ۳۸۶ تاریخ خطیب جلد ۸ صفحہ ۷۷، بغیۃ الوعاۃ صفحہ ۴۵۰ فضائل ابن کثیر صفحہ ۲۰۱ وغیرہ) لیکن حدیث اور تاریخ کے اس عظیم ثبوت کے باوجود مودودی صاحب واقعات کو غلط رخ پر ڈال کر مسلمانوں کو ایسے مغالطے کا شکار بنا رہے ہیں جس کی آگے چل کر کسی حال میں بھی تلافی نہیں ہو سکتی۔ یعنی آپ فرما رہے ہیں کہ ۶۵ھ تک قرآن کے حروف بلکہ پورے اہل عرب ہی عام حروف عربی کے لئے اعراب کے

نام سے آشنا نہ تھے۔ ابوالاسود دولی نے زیاد کے حکم سے پہلے گول نقطوں کی شکل میں حروف کے اوپر، نیچے اور بیچ میں ایک ایک نقطہ رکھ کر زیر، زبر پیش سے مسلم اہل عرب کو ۴۵ھ سے ۵۳ھ کے اندر کسی دن آشنا کیا (ترجمان صفحہ ۴۶) یعنی مودودی صاحب اس تاریخی مغالطے کی اس خوبی سے توثیق بلکہ تائید فرمارہے ہیں۔ جیسے نوشتہ جبرئیل کی حمایت مطلوب ہو لیکن ہمیں افسوس ہے کہ مودودی صاحب کی یہ غیر منصفانہ تحقیق علمی لحاظ سے تشنہ اور تحقیقی لحاظ سے نہ صرف نامکمل بلکہ قرآن کے متعلق بنیادی تصور یعنی حفاظت قرآن کے بھی خلاف ہے۔ کیا مودودی صاحب یہ فرما سکتے ہیں کہ ابوالاسود سے پہلے اہل عرب فن اعراب سے قطعاً ناآشنا تھے؟ (خوف خدا کو ملحوظ رکھ کر) کیا وہ بتائیں گے کہ زیاد نے کب یہ خدمت اس کے سپرد کی تھی؟ اور پھر ابوالاسود نے وثوق کے ساتھ کس سنہ میں اس خدمت کو سرانجام دیا؟ کیا جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اعراب القرآن فرمایا تو آپ اعراب کے موجودہ مفہوم سے واقعی ناآشنا تھے؟ (معاذ اللہ)

ابوالاسود کا تعارف

مودودی صاحب کے ہیرو ابوالاسود دولی جس کا اصل نام بڑے بڑوں کو معلوم نہیں۔ یہ نام سے زیادہ کنیت سے معروف تھے۔ بہت بڑے پائے کے ادیب اور شاعر و بالاتفاق شیعہ مسلک کے داعی اور ترجمان تھے اور حضرت امیر معاویہؓ کی شان میں ہجو کرنا مستزاد۔ اس کے اصل نام کا کوئی پتہ نہیں (شاید مودودی صاحب کو معلوم ہو) لوگ اسے

(۱) ظالم بن عمرو بن سفیان بن جندل بن یعمر بن حنش بن ثعلبہ بن عدی بن ویل بھی کہتے تھے اور (۲) عمرو بن عثمان یا (۳) عثمان بن عمرو کے نام سے بھی جانتے تھے۔ حافظ ابن حجر نے تو پہلے نام کو ترجیح دی ہے۔ بہرحال یہ ۶۸۱ م میں فوت ہوئے اور خالص شیعہ تھے (ملاحظہ ہو تہذیب التہذیب جلد ۱۲، صفحہ ۱۱ طبع دکن) اسی نے بہ تحقیق مودودی صاحب بصرے کے (اموی) گورنر زیاد (متوفی ۶۷۵ م) کے حکم سے قرآن پر اعراب لگائے۔

کیا اس واقعہ کی تکذیب کے لئے اتنا کافی نہیں ہے کہ ایک اموی گورنر قرآن کے معاملہ میں ایک غالی شیعہ کا ہرگز انتخاب نہیں کرسکتا۔ اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ ابوالاسود نے کوئی ایسا فرمان حاصل کرلیا ہوگا لیکن پھر بھی ہم تنہا اس کی دیانت پر کس طرح اعتماد کرسکتے ہیں۔ جبکہ اس نے کسی غیر شیعہ عالم کے تعاون سے نہیں بلکہ اپنے ہی ہم مشرب غالی شاگرد اور بار بار سزا یافتہ شرابی یحییٰ بن یعمیر عدوانی اسدی، بصری (متوفی ۷۳۰ م ۱۲۰ ھ یا ۷۴۶ م ۱۲۹ ھ) کے مشوروں سے یہ کام تکمیلی مراحل تک پہنچایا۔ (تہذیب التہذیب جلد ۱۱، صفحہ ۲۰۰) یہ یاد رہے کہ ہمارے نزدیک سرے سے یہ واقعہ ہوا ہی نہیں ہے۔ صرف مودودی صاحب کی خاطر ہم نے تھوڑی دیر کے لئے اسے تسلیم کرلیا ہے۔ (نوٹ) یحییٰ مذکور کی شیعہ کتب رجال میں تفصیل موجود ہے۔

مناسب ہوگا کہ اس مقام پر دو ایک ان قاریوں کی نشاندہی بھی کی جائے جنہوں نے قرآن میں تحریف و تصحیف کے پروگرام کے پیش نظر ۹۳۵ م و ۹۳۴ م کے لگ بھگ قرآن کے اعراب کا از سرنو جائزہ لے

کر سینکڑوں آیات کے نئے اعراب تجویز کر کے اپنے اپنے مدارس فکر سے جاری کئے میرا اشارہ مشہور مفسر ابن جریر طبری کے شاگرد قاری ابن شنبوذ شیعی اور اس کے پرزور حامی قاری ابو بکر العطار شیعی (متوفی ۹۶۵ م کی طرف ہے۔ ابن شنبوذ نے تو گرفتاری کے بعد بظاہر اعتراف کر لیا (اخبار مکہ ازرقی شائع کردہ ولیسٹن فیلڈ جلد ا صفحہ ۷، تذکرۃ الحفاظ ذہبی جلد ۳ صفحہ ۲۱۷) لیکن عطار اپنے استاد ابن شنبوذ کی گمراہ کن قرأت اور تجویز کردہ اعراب پر تادم زیست قائم رہا۔ کیونکہ وہ شنبوذی اکیڈمی کا پرزور حامی اور جان نثار تھا۔ (یاقوت حموی طبع مارگلیوتھ جلد ۶ صفحہ ۳۰۰ و ۵۰۰ بغیہ الوعاۃ صفحہ ۳۶، ابن الاثیر جلد ۸ صفحہ ۲۲۱. ابن تغری بردی (طبع جانپول جلد ۲ صفحہ ۸۹ وغیرہ) ان ہی کا ایک اور ساتھی قاری ابی محمد اسحاق خزاعی بھی نامور محرف ہو گزرا ہے۔ اس تحریفی پارٹی کے علاوہ دسویں صدی میلادی میں روایات کے بل بوتے پر جس شخص نے نئے عزم اور نئے ارادے سے تمام قرآن کے اعراب بدل ڈالے وہ محمد بن مقلہ شیعی (متوفی ۹۴۱ م) تھا۔ یعنی شنبوذی اور عطاری فتنہ کے دوش بہ دوش مقلی فتنہ بھی پرورش پا رہا تھا۔ ابن مقلہ چونکہ ماہر خطاط تھا لہذا اس نے اس غرض کے لئے کوفی رسم الخط کو آلہ کار بنایا یعنی اس میں ترمیمات کر کے خط ابن مقلہ کے نام سے ایک نئے رسم الخط کی داغ بیل ڈالی۔ اس عیار نے پوری مہارت سے قرآن کے نسخے (جدید خط میں) کتابت کرائے اور لوگوں میں تقسیم کر دیئے (ملاحظہ ہو مذاہب التفسیر الاسلامی طبع مصر ۶۴، ۶۵)

ان تاریخی شواہد کی موجودگی میں ہم کیونکر باور کریں کہ یہ جو

ہمارے دینی لٹریچر میں تضاد قرأت کے سینکڑوں نمونے پائے جاتے ہیں ان تحریفی پارٹیوں کی دستبرد سے محفوظ رہ گئے ہوں گے؟ کیا اگر وہ قرآن تک آسانی سے پہنچ سکتے تھے تو یہ تصنیفات کے انبار ان کی دسترس سے باہر تھے؟

یہ یاد رہے کہ فن اعراب سے عرب جاہلیت والے بخوبی آشنا تھے مودودی صاحب کا ذہن شاید اس طرف منتقل نہ ہوسکا (ملاحظہ ہو ابن ندیم صفحہ ، طبع جلی مصر)

نقاط القرآن

دنیا کے لٹریچر میں تنہا ادب اور انشاء کے لحاظ سے ہی دیکھا جائے تو قرآن حکیم یہاں بھی تمام لٹریچر پر فائق نظر آئے گا اور یہ فوقیت کسی زبان کو اس وقت تک حاصل نہیں ہوسکتی تاوقتیکہ وہ کلی طور پر پختہ ، کامل واکمل نہ ہو یعنی بول چال سے لے کر تحریر تک کے ہر عیب اور نقص سے پاک نہ ہو۔ اسی بناء پر ہی تو قرآن حکیم عربی مبین (نحل ۱۰۳) یعنی صاف، ستھری اور واضح عربی ہے جس کے نہ تو املا میں کوئی الجھاؤ ہے اور نہ تحریر میں ابہام !! لیکن یہ بڑا مسئلہ ہوگا کہ ہم بغیر دلیل کے یہ تسلیم کرلیں کہ عربی کے واضعین زبان کے ایسے قواعد سے ناآشنائے محض تھے جوکہ ایجاد و تخلیق کے ابتدائی مراحل میں ان کے سامنے ہونے چاہئیے تھے؟ فرض کرو ہم یہ تسلیم کرتے ہیں کہ عربی اپنی ایجاد کے وقت سے لے کر اسلام کی نصف صدی تک یوں ہی بے قاعدہ اور بے نقط زبان رہی تو فرمایا جائے کہ آخر وہ کونسا طریق فہمائش تھا جس سے اجنبی لوگ بے

تکلف با۔ تا۔ ثا اور جیم، حا و خا وغیرہ حروف میں امتیاز کرتے ہیں ۔ راقم الحروف نے ایک ایف اے پاس سے بطور امتحان سورہ نور کی آیت ۲٦ بغیر نقطوں کے لکھ کر اسے پڑھنے کے لئے کہا تو اس نے طیب کو طبیب (ڈاکٹر) اور خبیث کو حبیب (درست) پڑھا۔ اسی طرح نقطوں کے بغیر مشرکین اور متر کین، موحدین اور موجدین ۔ رحمت اور زحمت۔ غافل اور عاقل میں کونسی وجہ امتیاز باقی رہ جاتی ہے؟ اب فرمایا جائے کہ اتنی ناقص اور ناپختہ زبان میں قرآن کی حفاظت اور اشاعت کی کیا صورت نکالی گئی ہوگی؟

حقیقت یہ ہے کہ جو زبان اپنے مطالب اور مفاہیم ادا کرنے میں ناپختہ و نامکمل ہو اسے "مبین" صاف منجھی ہوئی اور مکمل کہا ہی نہیں جاسکتا۔ اب یہ مودودی صاحب کے اختیار میں ہے کہ ایک بے سند مفروضہ کو ثابت کرنے کے لئے محض اپنی شخصیت اور علمی بلند مقام سے ناجائز فائدہ اٹھاکے حاملین قرآن کو یہ تاثر دے دیں کہ

اہل عرب "حروف کے لئے نقطے بھی ہونے چاہئیں" اس کو کبھی محسوس نہ کرسکتے تھے۔ بلکہ اسلامی عہد میں بھی صحابہؓ، رسولؐ، جبرئیل یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے بھی نقطوں کی ضرورت عربی حرف تہجی کے لئے محسوس نہیں کی۔ پہلی مرتبہ عبدالملک کے حکم سے حجاج نے دو گمنام عالموں کے ذریعے یہ بے ضرورت ایجاد کرکے دنیائے عرب کو اس کی ضرورت سے آشنا کردیا۔ (ترجمان القرآن کا خلاصہ)

مودودی صاحب نے بیک جنبش قلم کسی زبان کے ان بنیادی اجزاء کا ہی انکار کردیا جو اس کی تشکیل میں عنصر فعال کی حیثیت رکھتے ہیں۔

لیکن یہ فرمایا جائے کہ (۱) اللہ، رسولؐ وجبرئیلؑ کا (منفی انداز میں) منشاء آپ پر کیونکر منکشف ہوا؟ (۲) اسلامی عہد کے ۵۶ سال تک لفظی اشتباہ اور التباس کو دور کرنے کا کیا ذریعہ تھا؟ (۳) اگر بخیال آپ کے تضاد قرأت کے بنیادی اسباب میں سے ایک سبب یہ بھی تھا کہ حروف بے نقطہ لکھے جاتے تھے تو اس حالت میں حفاظت قرآن کے الٰہی وعدے (حجر ۹) کی کیا پوزیشن رہ جاتی ہے۔ (۴) قرآن کے متعلق تمام مسلمانوں کا عقیدہ ہے کہ اس میں نہ تو اضافہ کی گنجائش ہے اور نہ ہی حذف کا امکان یعنی زبر زیر اور ایک ایک نقطہ تک اس کا محفوظ ہے۔ پھر یہ صورت کہاں سے نکال لی گئی کہ کروڑوں اعراب اور اتنے ہی نقطے اس قرآن میں اضافہ کئے گئے جسے خدا نے یوں ہی چھوڑ دیا تھا؟

(۵) وہ دو گمنام عالم جو قرآن پر اضافہ اور تکمیل کے لئے مامور کئے گئے تھے عبدالملک (متوفی ۷۱۵ م) اور حجاج بن یوسفؒ (متوفی ۷۱۸ م) نے ان کا نام کیونکر صیغہ راز میں رکھا؟ اس مفروضے کو تسلیم کرلینے کے لئے آپ کے پاس کیا سند ہے؟ ہمارے خیال میں اس طبع زاد مفروضہ کی تکذیب کے لئے اتنا ہی کافی ہے کہ اتنی اہم ایجاد اور عظیم کام سرانجام دینے والوں کا نام و پتا آپ قیامت تک نہیں بتاسکتے۔ مودودی صاحب دراصل اس بدگمانی میں بتلا ہیں کہ اگر اپنے لٹریچر کی حقیقی غلطیاں تسلیم کرلی گئیں تو لامحالہ معترضین کی بہت سی باتیں ماننی پڑیں گی اور یہ علمی پندار کے منافی ہوگا لیکن بندہ پرور ایسے معترضین پر لعنت بھیجئے کہ وہ تو آپ کی کسی بات کا بھی اعتبار نہیں کریں گے لیکن ضد میں آکر قرآن کے متعلق ایسا غیر ضروری لٹریچر پیش کرنا یا پھر طبع زاد مفروضات پر اس

حد تک ایمان لے آنا کہ وہ فرمودہ خدا ہوں ، قرآن کی عظمت اور عصمت کو مجروح کرنے کے علاوہ بڑے انتشار کا موجب ہوگا کیا آپ نے سوچا بھی ہے کہ علمی مذاکرات میں خدا وجبرئیل کو طبع زاد نظریات کا پابند بتانا کتنا جرم عظیم ہے؟

افسوس ہے کہ ہم عرب جاہلیت کے اشعار ، کتبات اور خط حمیری (عربی خط کے ماخذ) کے چربے اس اشاعت میں شامل ہنیں کر سکے لیکن اگر حیات مستعار نے چند روز اور وفا کی تو انشاء اللہ کسی وقت ان کے فوٹور لے کر قارئین پر اس حقیقت کو بے نقاب کر دیا جائے گا کہ عرب اسلام سے پہلے ہی نقطہ کے مفہوم سے آشنا تھے اور وہ برابر مشتبہ حروف میں امتیاز کے مواقع پر اس کا استعمال کرتے رہے۔

زیادات القرآن

کہا جاتا ہے قرآن میں بعض کلمات کسی اضافے کے محتاج ہیں اور وہ اضافہ دراصل قرآن ہی تھا مگر درج ہونے سے رہ گیا ۔ مشہور ہے کہ حضرت عبداللہ بن عباسؓ اور حضرت ابی بن کعبؓ کے مصاحف میں یہ ضمیمے موجود تھے جنہیں بعد میں محفوظ کر لیا گیا تھا۔ ذیل میں ایسے ہی اضافوں کے چند نمونے درج کئے جاتے ہیں۔

(۱) **فما استمتعتم به منهن فاتوهن اجورهن (نساء ۲۴)**
اجورهن کے بعد **الیٰ اجل مسمی** پڑھا جاتا تھا تاکہ متعہ کا قرآنی جواز نکل آئے (**العقیدة الشریعیة فی الاسلام صفحه ۲۰۲ طبع مصر**)
(۲) **ان تبتغوا فضلا من ربکم (البقرة ۱۹۸)** کے بعد " فی مواسم الحج "

(کشاف صفحہ ۱۸۵، جلد ۱) (۳) النبی اولی بالمومنین من انفسھم وازواجہ امھاتھم (احزاب-۶) کے بعد وھو ابلھم (کشاف جلد ۲ صفحہ ۲۰۶) (۴) سورہ مجادلہ کی ۷ ویں آیت یوں تلاوت کی جاتی تھی۔ ما یکون من نجوی ثلاثة الا الله رابعھم ولا اربعة الا الله خامسھم ولا خمسة الا الله سادسھم ولا اقل من ذالک ولا اکثر الاالله معھم اذا اخذا فی التناجی (تفسیر کبیر صفحہ ۱۶۲ جلد ۸ طبع بولاق ۱۲۸۹ھ) (۵) وامرأته قائمة (ہود - ۷۱) وامرأته قائمة وھو قاعد (مذاہب تفسیر صفحہ ۲۳ طبع مصر) (۶) یامرون بالمعروف وینھون عن المنکر (عمران ۱۰۴) کے بعد ویستعینون بالله علی ما اصابھم (طبری جلد ۴، صفحہ ۲۴ طبع مصر) (۷) وجئت بایة من ربکم فاتقوا الله (عمران ۵۰) کے ساتھ فاتقو الله من اجل ما جئتکم بہ واطیعون فیما دعوتکم الیہ (کشاف جلد ۱ صفحہ ۱۴۸) وغیرہ یہ تمام زیادات ابن شنبوذ ی) نے اپنے مصحف میں درج کئے تھے اور ان کا حال آپ معلوم کر چکے۔ یہ تفصیل کا مقام نہیں۔ واللہم بتا دیتے کہ ابی بن کعب اور عبداللہ بن عباس کے سلسلہ ہائے اسناد میں ۹۹ فیصد کس کیمپ کے راوی محو کمل تھے۔

تفسیر القرآن

قرآن چونکہ خالص عربی زبان میں نازل ہوا تھا اور ادھر عہد نبوی سے لے کر خلفائے راشدین کے زمانہ تک اطراف واکناف عالم میں قرآن

واسلام کی اشاعت دن بدن بڑھ رہی تھی، نومسلم عجمیوں کے لئے قرآن فہمی کے لئے اہل زبان کی طرف رجوع کرنا لازمی امر تھا اندریں حالات ضرورت تھی کہ آیات الٰہی کی فہمائش کے لئے کوئی طریق کار تجویز کیا جاتا اور یہ طریق کار تعبیر تھا تفسیرالقرآن سے۔ کتنا مبارک اقدام ہے تفسیر القرآن بیان کرنا؟ لیکن بدقسمتی سے ہوا یہ کہ ہر لفظ کی تشریح اور ہر آیت کی تفسیر میں تضاد وتخالف کا وہ بارود بھر دیا گیا کہ کسی سلیم العقل کے لئے باور کرنا مشکل ہو چلا کہ ان تفاسیر کے اندر قرآنی آیات کے جو مطالب اور جو مفاہیم بیان کئے جاتے ہیں کیا واقعی قرآن ان کا محتاج ہے؟ اور پھر یہ بھی یقین کرالیا گیا کہ ایسی تفسیر خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہی سے منقول ہے ذیل میں بطور مثال دو آیات کی تفسیر ملاحظہ ہو۔

(۱) و القناطیر المقنطرة من الذهب و الفضة (عمران ۱۴)

"یعنی انسان کے لئے مرد وعورت کے رشتہ میں اولاد میں، چاندی وسونے کے قنطاروں میں، چنے ہوئے گھوڑوں میں، مویشیوں میں اور کھیتی باڑی میں دل کا اٹکاؤ اور خوشنمائی رکھ دی گئی ہے۔"

یہ قنطار کیا ہے؟ حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک سوال کے جواب میں فرمایا کہ ایک ہزار اوقیہ (وزن) کا ایک قنطار ہوتا ہے (احمد وابن ماجہ) اور حضرت ابوہریرہ (متوفی ۶۷۶ م) فرماتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم (متوفی ۶۳۲ م) نے قنطار کی تشریح میں بارہ ہزار اوقیہ فرمایا ہے۔ (حاکم)

(۲) نخذ اربعة من الطیر نصرهن الیک (بقرة ۲۶۰) "یعنی اے ابراہیم چار پرندے لے لو اور لے کر پھر کیا کرو" یہاں "صرهن"

نے الجھن پیدا کردی۔ حضرت ابن عباسؓ (متوفی ۱۶۸۸) فرماتے ہیں کہ صرھن کے معنیٰ ہیں "قطعھن" یعنی انہیں ذبح کردو (ابن جریر جلد سوم صفحہ ۲۷) آگے چل کر اس معنی کے برعکس مکرر ابن عباسؓ کا ارشاد ہے کہ صرھن کے معنیٰ ہیں اوثقھن یعنی ان پرندوں کو زندہ باندھ لو (حوالہ مذکور) ذبح نہ کرو۔ یہ تھا نمونہ تفسیرالقرآن کا۔ یعنی جو بات آپ سمجھنا چاہیں اسے بھاری پتھر کی طرح چوم کر دور ہٹ جائیں اب دیکھنا یہ ہے کہ اس موضوع پر سب سے پہلے کس گروہ کے افراد نے خامہ فرسائی کی۔ مورخ ابن الندیم (متوفی ۹۹۵ م) کی تصریح یہ ہے کہ تفسیرالقرآن سب سے پہلے سعید بن جبیر تابعی کوفی (متوفی ۷۱۲ م) نے لکھی اور سعید کے متعلق شیعہ مؤرخین اور نسابین کا دعویٰ ہے کہ وہ خالص شیعہ تھے۔ چنانچہ علامہ جلال الدین بن مطہر (متوفی ۱۳۲۶ م) نے خلاصہ الاقوال میں اور علامہ ابوعمر کشی نے کتاب الرجال میں سعید مذکور کو بدلائل شیعہ ثابت کیا ہے۔ نیز ملاحظہ ہو قرب الاسناد حصہ سوم مصنفہ حمیری (متوفی ۷۸۹ م) ۔ بلکہ امویوں کے خلاف بغاوت کرکے اشعث شیعہ سے مل جانے کے جرم ہی میں حجاج نے اسے قتل کرادیا تھا (کتب رجال) سعید کے بعد سدی کبیرہ اسماعیل بن عبدالرحمن کوفی ابو محمد قرشی (متوفی ۴۴ھ) اور سدی صغیر محمد بن سائب بن بشیر کلبی (متوفی ۷۷۲م) اور جابر بن یزید الجعفی (متوفی ۴۴ ھ) نے قرآن مجید کی تفاسیر لکھیں۔ یہ تمام حضرات فن تفسیر کے امام مانے جاتے ہیں اور یہ وہ زمانہ تھا جبکہ اہل سنت اس فن سے ناآشنائے محض تھے۔ امام ذہبی (متوفی ۱۳۴۸ م) اور حافظ بن حجر (متوفی ۱۴۴۹ م) نے آئمہ مذکورین کا شیعہ کے علمائے کبار

میں شمار کیا ہے - خود شیعہ مؤرخین ان حضرات کا نام بحیثیت اول المفسرین ہنایت فخر اور احترام سے لیتے اور شیعہ کا علوم قرآنی میں تقدم ثابت کرنے کے لئے انہی کو پیش کرتے ہیں (ملاحظہ ہو ابن قتیبہ (متوفی ۸۸۹ م) علامہ نجاشی اور ابو جعفر طوسی (متوفی ۱۰۶۸ م) کی تصریحات) -

ان سب سے زیادہ جامع صورت میں تمام علوم قرآنی پر محیط تفسیر امام ابو عبداللہ محمد بن عمر عرف واقدی (متوفی ۸۲۱ م) نے " الرغیب فی علوم القرآن " نامی لکھی اور واقدی کا شیعہ ہونا بالاتفاق مسلم ہے -

فضائل قرآن

قرآن مجید کی آیات اور سوروں کے فضائل میں جتنی روایات ہیں ان میں سے فی ہزار ایک بھی صحیح ہنیں ہے - آپ آیۃ الکرسی[1] پڑھیں تو " جن " تابع ہوجائیں گے - " واقعہ " پڑھیے تو بھوک ہنیں لگے گی " قل ھواللہ " پھونکیے تو دنیا بدل جائے گی - الغرض قرآن میں جتنا بھی معجزاتی اور کراماتی رنگ بھرا ہوا ہے اس کا تعلق فضائل قرآن سے ہے - ادھر

---

[1] آیۃ الکرسی کے انہی شیعہ فضائل کا کرشمہ ہے کہ مسلمانوں کا کوئی ڈرائنگ روم ایسا نہیں ہے کہ جہاں اس آیت کا طغریٰ زینت دیوار نہ ہو - بڑے بڑے شیعہ بیزار صاحبان علم و فضل کے در و دیوار اس آیت کے طغروں سے سجے ہیں بظاہر اس میں کچھ حرج نہیں لیکن شیعہ شعار کا نباہ بھی تو ایک جرم ہے - شیعہ کے ہاں اس کی فضیلتوں کا باعث اس آیت کا آخری ٹکڑا ہے - " ھو العلی العظیم " ان کی باطل مراد کے مطابق بات یوں ہے کہ اوپر جس ہستی کی شان بیان ہوئی ہے - یہ " وہی عظمت والا علی ہی تو ہے - " ان کے گھروں اور اداروں میں ایسے طغرے ہوتے ہیں جن میں باقی متن سے ہٹ کر یہ ٹکڑا نمایاں اور بڑا کرکے لکھا ہوتا ہے - ان کے ہاں ایک شیر (اسد) کا نقش ہوتا ہے جس کی باڈی میں پوری آیت لکھی ہوتی ہے - وہاں ان کا مطلب ہوتا ہے کہ علیؓ ، اسد ہے اور یہ آیت اسی شیر کی شان بیان کرتی ہے -

شیعہ کا دعویٰ ہے کہ اس موضوع پر لکھنے میں بھی انہی کا تقدم ہے کیونکہ سب سے پہلے امام رضا (متوفی ۸۱۸ م) کے صحابی حسن بن علی بن ابی حمزہ بطائنی اور محمد بن خالد برقی نے پھر امام حسن عسکری (متوفی ۸۱۸ م) کے مصاحب ابو عبداللہ احمد بن محمد بن یسار بصری اور کلینی (متوفی ۹۳۹ م) کے استاذ علی بن ابراہیم احمد بن محمد بن عمار کوفی (۹۵۵ م، ۳۴۶ ھ) نے فضائل قرآن پر لکھا۔ امام عسکری کے ایک اور مصاحب کا نام بھی تاریخ میں ثبت ہے جس نے اس موضوع پر طبع آزمائی کی ان کا اسم گرامی محمد بن مسعود عیاشی ہے۔ فضائل کی ساری کہانیاں شیعیت کے شعبہ باطنیت کے طفیل پھیلیں۔

جلال الدین سیوطی ۱۵۰۵ م) نے امام شافعی (۸۲۰ م) کو بھی فضائل قرآن کا مصنف قرار دے دیا ہے لیکن امام رضا کے مصاحب بطائنی اور برقی آپ سے پہلے اس پر لکھ چکے تھے۔ علاوہ ازیں شیعہ نے اس ضمن میں جتنی روایات لی ہیں ان کا مآخذ حضرت ابی ابن کعب صحابی رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی بتائی جاتی ہے اور ابی کو یہ حضرات طرفدار اور شیعان علی میں سے شمار کرتے ہیں۔ چنانچہ سید علی بن صدرالدین المدنی (۱۷۰۵م، ۱۱۱۸ھ) نے الدرجات الرفیعہ فی طبقات الشیعہ میں ائمہ اہل بیت کی تصریحات سے ثابت کیا ہے کہ آپ شیعہ تھے (حالانکہ صحابہ کرام کے متعلق ایک مسلمان گروہ بندی جیسا مکروہ تصور بھی نہیں کر سکتا۔

ناسخ، منسوخ قرآن

علم الہیٰ میں کوئی نقص نہیں ہے اسے اپنے بندوں کی مصلحتوں اور تقاضوں کا ولادت سے لے کر قبر تک کا علم ہے - غیر محدود علم ہے، سب پر حاوی علم ہے، خشک کا علم ہے تر کا علم ہے ، بر کا علم ہے بحر کا علم ہے- اس نے کوئی ایسا حکم نہیں دیا جو آج تو بندوں کے حسب حال ہو مگر آگے چل کر ان کے تقاضوں کے برعکس ہوگیا- اس نے کوئی ایسی آیت نہیں اتاری جو کچھ عرصہ کے بعد معطل اور باطل قرار پائی جائے اس نے کسی ایک کتاب میں ایک ہی امر سے متعلق دو متضاد حکم نہیں دیئے تاکہ تلاوت بھی کئے جائیں اور ان سے متضاد مفہوم بھی مستنبط ہوتا رہے- اور پھر ایک منسوخ بھی ہو؛ بہرحال یہ عقیدہ کہ آج بھی قرآن کا ایک حصہ تلاوت کئے جانے کے باوجود منسوخ الحکم ہے علمائے راسخین نے اسے ایک ثانیہ کے لئے بھی تسلیم نہیں کیا- یہ علاوہ اس کے کہ اس موضوع پر بھی امام جعفر صادقؑ کے صحابی، جناب عبداللہ بن عبدالرحمن اصم مسمعی نے اور پھر صدر اول کے ایک دوسرے شیعہ عالم، دارم بن قبیصہ بن نہشل بن مجمع عرب ابوالحسن تمیمی الدارمی (صحابی امام رضا) نے کتاب "الوجود والنظائر" اور کتاب "الناسخ ومنسوخ" لکھیں اسی طرح شیعہ کے جلیل القدر مجتہد حسن بن فضال (متوفی ۸۳۸م، ۲۲۴ھ) اور احمد بن محمد بن عیسیٰ قمی نے بھی اس عنوان سے کتابیں تصنیف کیں- اس مقام پر سیوطی کو اعتراض ہے کہ ناسخ ومنسوخ کے اولین مصنف حسن بن فضال کے ہم عصر ابوعبیدہ قاسم بن سلام (متوفی

۸۳۸ م ۲۲۴ ھ) ہیں لیکن تاریخی شواہد سیوطی کے ادعاء کے برعکس جاتے ہیں کیونکہ ابوعبیدہ، اصم مستعی بلکہ وارم بن قبیصہ سے بھی عرصہ بعد نمودار ہوا۔

ناسخ ومنسوخ کا دائرہ عمل چونکہ بے حد وسیع ہے اس لئے مثال کے طور پر ہم نے کوئی آیت پیش نہیں کی بہرحال اس میں بھی شیعہ ہی کا تقدم ثابت ہے۔

احکام القرآن

سیطون کا دعویٰ ہے کہ احکام القرآن کے نام اور موضوع پر سب سے پہلے امام شافعی (۸۲۰ م) اور آپ کے بعد طبقات الحفاظ کے مصنف امام قاسم بن اصبغ بن یوسف بیانی قرطبی اخباری لغوی (متوفی بعمر ۹۳ سال ۹۵۰ م، ۲۴۰ ھ) نے کتابیں لکھیں۔

لیکن شیعہ کے دعویٰ اور ابن ندیم کی الفہرست میں تصریح سے ثابت ہوتا ہے کہ سب سے پہلے امام باقر کے صحابی محمد بن سائب کلبی (متوفی ۷۶۲ م، ۱۴۶ ھ) نے "احکام القرآن" تالیف کی اور یہ ظاہر ہے کہ کلبی کی وفات کے وقت امام شافعی کی عمر صرف چار سال تھی۔ یہ یاد رہے کہ کلبی نے یہ کتاب حضرت ابن عباسؓ سے روایت کی ہے جس کے خود ساختہ ہونے میں ادنیٰ سا شبہ بھی نہیں ہوسکتا۔

غرائب القرآن

سیوطی نے کتاب الاوائل میں تصریح کی ہے کہ سب سے پہلے ابوعبید معمر بن مثنیٰ (متوفی ۸۲۳ م) نے غرائب القرآن لکھی لیکن یاقوت حموی (متوفی ۱۲۲۸م) نے معجم الادبا اور خود سیوطی نے "بغیہ الوحاۃ" میں بوضاحت لکھا ہے کہ ابان بن تغلب (۷۵۸ م) ہی غرائب القرآن کے پہلے مصنف ہیں۔ ابان کے بعد جن شیعی اہل علم نے غرائب القرآن لکھے ان کے اسمائے گرامی حسب ذیل ہیں:۔

(۱) ابو عثمان مارنی شیعی (متوفی ۸۴۳ م ۲۲۸ ھ) (۲) علامہ ابن درید کوفی لغوی شیعی (متوفی ۹۳۲ م. ۳۲۱ ھ) اور ابن درید سے پہلے امام ابوبکر بجستانی محدث (متوفی ۸۶۴ م) نے بھی غرائب القرآن کے نام سے جدول وار ایک قیمتی تصنیف کی تھی جوکہ ۱۹۰۷م میں مصر سے شائع ہوچکی ہے اور خاکسار کے پاس بھی ہے۔

نوادرات قرآن

کسی لفظ میں ایسا مفہوم پیدا کرنا یا کسی عبارت سے وہ معنی نکالنے جس میں ندرت اور قلت پائی جائے اسے نادر کہا جاتا ہے۔ یہ ایک ہنایت احتیاط طلب اور پرخطر موضوع ہے۔ ہر کس وناکس اگر اس میں دلچسپی لینے لگا تو قرآن بازیچہ اطفال ہوکر رہ جائے گا۔ اب جس وقت یہ ایک پرخطر فن ہے تو جو لوگ بے باکانہ اس سے دلچسپی لے رہے ہیں وہ ہنایت ہی مہلک راہ پر گامزن ہیں۔

قرآن میں ایک لفظ ہے "بغتۃ" یعنی قیامت "اچانک" ہوگی بس اب کیا تھا کہ یار لوگوں نے اس کا تعین ہی کردیا۔ یعنی بغتۃ کے عدد نکال کر یہ معنی پیدا کردیئے گئے کہ نزول آیت کے اٹھارہ سو دو برس بعد قیامت قائم ہوجائے گی۔ آگے چل کر اس کے مفہوم میں اور بھی وسعت پیدا کردی گئی یعنی صحابہ اور آئمہ یا دیگر اشخاص کے مناقب ومثالب تک کو اس کی ذیل میں لایا گیا پھر جو کسر رہ گئی وہ صوفیاء کے اسرار ورموز سے پوری کردی گئی۔ ذیل میں صرف مناقت اور مثالب کی چند مثالیں دے کر نوادرات کا تعارف کرایا جائے گا لیکن پہلے آپ نوادرات نویسوں کے اسمائے گرامی ملاحظہ فرمالیں۔

(۱) امام حسن عسکری (متوفی ۸۷۳ م) کے مصاحب احمد بن محمد سیاری بصری (۲) ابوالحسن محمد بن احمد بن محمد عرف الحارثی شیعی (۳) شیخ علی ابن ابراہیم بن ہاشم شیعی (۴) علی بن حسین بن فضال (۲۳۴ ھ) شیعی (۵) ابو نصر عیاشی شیعی وغیرہ۔ ابن ندیم نے ان کے علاوہ اور نام بھی تحریر کئے ہیں۔

اب آپ "نوادرات" ملاحظہ فرمائیں۔

(۱) سورہ مائدہ کا ۹۱ آیت میں ہے کہ "بلا شبہ ابلیس کی یہ تمنا ہے کہ تمہارے درمیان شراب نوشی اور قمار بازی کے ذریعے دشمنی اور عداوت پھیلائے اور اس طرح ذکر الہیٰ سے روکے۔" یہاں شراب نوشی سے ابوبکرؓ اور قمار بازی سے عمرؓ مراد ہیں۔ (تفسیر مذاہب صفحہ ۲۱۳ طبع مصر)۔

(۲) بنی اسرائیل کو جس گائے کے ذبح کرنے کا حکم دیا گیا تھا اس

سے مخالفین علیؓ یعنی عائشہ (متوفاۃ ۶۹۸ م) طلحہؓ (شہید ۶۵۶ م) اور زبیرؓ (شہید ۶۵۶ م) مراد ہیں۔ (تاویل مختلف الحدیث نیور صفحہ ۸۶ طبع مصر)۔
(۳) سورہ نساء کی آیات (۵۱ و ۵۲) سے مراد غاصب معاویہؓ (متوفی ۶۸۰ م اور عمر بن العاصؓ (متوفی ۶۶۳ م) ہیں) اصول کافی مصنفہ کلینی مرحوم ۹۳۹ م صفحہ ۲۷۱ھ طبع مصر) (۴) سورہ نور کی پینتیسویں آیت میں " المصباح " سے مراد حسن (۶۶۹ م) اور المصباح فی الزجاجہ سے حسین شہید (۶۸۰ م) شجرۃ المبارکہ سے ابراہیمؑ (۲۲۰۱ ق م) لا شرقیہ ولا غربیہ سے دین ابراہیم (جوکہ یہودی تھے نہ ہی نصرانی " نور علی نور " سے امام کے بعد دوسرا امام " یھدی اللہ لنورہ " سے ائمہ اہل بیت۔ " من یشاء " سے وہ ائمہ جو ان اوصاف کے حامل تھے مراد ہے۔ تفسیر علامہ ابی الحسن علی بن ابراہیم معروف قمی (سلام) مطبوعہ طہران صفحہ ۶۵۶) (۵) " و اوحی ربک الی النحل " (نحل ٦٨) سے اہل بیت مراد ہیں اور یخرج من بطونھا شراب (۶۹) سے مراد ہے وہ قرآن جو اہل بیت کے منہ سے نکل رہا ہے (کتاب الاغانی صفحہ ۳۰ جلد ۳) ۔ (۶) سورۃ البلد ۶ تا ۸ میں " عینین " سے رسول اللہ ، " لساناً " سے علی " شفتین " سے حسن و حسین اور " ھدیناہ النجدین " سے شبیر وشبر کی ولایت مراد ہے (قمی صفحہ ۷۲۶ م)
(۷) سورہ حجر آیت ۸۷ میں " مثانی " کی تفسیر امام ابو جعفر (۷۳۱ م) سے یوں منقول ہے " مثانی " سے مراد ہمارا خاندان ہے جسے اللہ نے نبی عطا فرمایا۔ اور ہم وجہ اللہ ہیں جو تمہارے درمیان پھر رہے ہیں جس نے ہمیں پہچانا جنت اس کا مقام ہے اور جس نے نہیں پہچانا جہنم اس کا

ٹھکانا ہے۔ (قمی صفحہ ۳۵۳)۔ (۸) سورہ زمر آیت ۵۶ میں "نوراللہ" اور "جنت اللہ" وغیرہ صفات خداوندی سے امام علی مراد ہیں قمی صفحہ ۲۴۹ یا صفحہ ۵۷۹)۔ (۹) اعراف ۴۴ میں آخرت میں منادی کرنے والے سے حضرت علی مراد ہیں جو اپنے مخالفین پر لعنت کا اعلان کریں گے۔ (قمی صفحہ ۱۱۶) اسی طرح (۱۰) سورہ توبہ میں آذان من اللہ سے مراد علی ہیں یعنی خدا حج اکبر کی طرف جو بلا رہے ہیں تو اس سے مراد علی کی طرف بلانا ہے۔

ذیل میں آپ سنی نوادرات بھی ملاحظہ فرمالیں اور اندازہ کرلیں کہ پیشرو اور بانیوں کا اثر بعد میں آنے والوں پر کتنا گہرا ہوتا ہے؟ سورہ فتح کی ۲۹ ویں آیت میں "اخرج شطاہ" سے مراد ابوبکر (متوفی ۶۳۴م) "فآزرہ" سے عمرؓ (شہید ۶۴۴م) "فاستغلظ" سے مراد عثمانؓ (شہید ۶۵۵م) اور "فاستوی علی سوقہ" سے علیؓ (شہید ۶۶۱م) مراد ہے (تفسیر مذاہب صفحہ ۳۳۲ طبع مصر) سورہ عصر کی حضرت ابی ابن کعبؓ یوں تفسیر فرماتے تھے۔ ان الانسان لفی خسر سے ابوجہل (مقتولہ در بدر ۶۲۳م) " الا الذین امنوا" سے ابوبکرؓ "وعملوا الصالحات" سے عمر "وتواصوا بالحق سے عثمان اور "وتواصوا بالصبر" سے مراد علی ہیں (بروایت امام ابوالحسن الراعدی نیساپوری، (۱۰۷۵م) بحوالہ ریاض النضرۃ جلد ا صفحہ ۳۴ تفسیر رازی جلد ۸، صفحہ ۵۹۲ طبع بولاق مصر)۔

بلاغۃ القرآن

بلاغت قرآن پر تفصیل سے لکھنے کا یہ محل نہیں ہے پھر مضمون

کی تنگ دامانی تو مانع ہے ہی قرآن کیا ہے؟ فاتحہ سے لے کر والناس تک بلاغت، سراپا بلاغت، تمام بلاغتوں کا ماخذ وضاحتوں کا منبع لیکن اس موضوع پر بھی سب سے پہلے جس بزرگ نے قلم اٹھایا ایک شیعہ ہی تھے۔ میری مراد علامہ ابوالفتح عثمان بن جنی شیعی (متوفی ۱۰۰۲م، ۳۹۳ھ) کی ذات گرامی ہے۔ آپ نے بلاغت القرآن پر لکھا اور بلاغت کے نشہ میں اس قدر بہہ گئے کہ خود قرآن میں بھی آپ کو بلاغت کی غلطیاں نظر آنے لگیں چنانچہ سورہ یوسف کی آٹھویں آیت میں خیر حفظاً۔ آپ کے نزدیک بلاغت کی رو سے غلط ہے۔ خیر حفظاً (حا کی زیر) ہونا چاہئیے وغیرہ یہ بحث کا مقام نہیں ورنہ آپ کو معلوم ہوجاتا کہ ابن جنی یہاں خود ہی غلطی پر ہیں!! ابن جنی کے بعد ایک سنی مسلمان امام عبدالقادر جرجانی (متوفی ۱۰۷۸م) نے اس عنوان پر لکھا آپ کی بے نظیر تالیفات مفتی عبدہ کے شاگرد رشید علامہ سید رضا نے شائع کردی ہے۔ بلاشبہ امام جرجانی نے قرآن کا حق ادا کیا ہے جزاک اللہ۔ تاہم وہ بشر تھے پھر پیشر شیعہ مصنف کے خیالات سے استفادہ بھی لازمی امر تھا!! بہرحال بلاغت کے فن شریف تک کو شیعہ نے ترتیب دیا اور اس میں بھی انہی کا تقدم ثابت ہے۔

گزشتہ صفحات میں آپ نے دیکھ لیا کہ میں نے اپنی حد تک محنت اور جانفشانی سے اختلاف قرأت اور علوم قرآن کا پس منظر تاریخ اور ماخذ کا کھوج لگایا ہے۔ اب فیصلہ قارئین پر چھوڑ دینا مناسب ہوگا کہ وہ غیر جانبداری کا فرض باحسن طریق سرانجام دے سکتے ہیں۔ مودودی صاحب کا ہمارے دل میں جو احترام ہے وہ اس تبصرے کی وجہ سے کم نہیں ہوا

کیونکہ آپ کی بہت سی خوبیوں اور کمالات کا اعتراف کرنا علمی رواداری کا متقاضی ہے لیکن یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب اختلاف قرآت کے مؤلفین جامعین اور مصنفین شیعہ ہی تھے تو اب ہمارے لئے رد و قبول کا کونسا معیار ہونا چاہئیے ۔ خاص کر جبکہ ہمارے بہت سے عالم بھی اس تحریک کے افکار ونظریات کا بری طرح شکار ہوں؟

یہ سوال بے حد اہم اور بنیادی ہے اسے نظر انداز کرنا ہماری علمی موت کے مترادف ہوگا کیونکہ شیعہ دراصل ابتداء اسلام ہی سے سیاسی، ثقافتی اور علمی اعتبار سے دیگر تمام فرقوں پر فائز و متفوق تھے۔ ان کی بہت سی علمی خدمات ایسی ہیں جو کسی دوسرے ذریعہ سے ہم تک نہیں پہنچ سکتی تھیں۔ اس حد تک تو ہمیں ان کا شکر گزار ہونا چاہئیے لیکن اس اعتراف کے بعد کہ اگر یہ گروہ نہ ہو تو ہم تمام علوم قرآنی کے ذخیرے سے محروم رہ جاتے ہمارے لئے سوائے اس کے چارہ کار نہیں کہ ہم علوم قرآنی کے معاملے میں ان سے اخذ وقبول میں محتاط رہیں اور اختلاف قرآت میں تو یہاں تک احتیاط کی ضرورت ہے کہ ان کی حلفیہ مرویات پر بھی اعتبار نہ کرنا چاہئیے۔ اور اس ضمن میں ہمارا مسلمانوں کو وہی مشورہ ہے جوکہ سلف صالحین اپنی وصایا میں لکھ گئے تھے۔ حافظ ابن حجر (متوفی ۱۴۴۹م) فرماتے ہیں کہ :۔

" خارجی یا رافضی یا کوئی اور (بدعتی) عمداً خواہ نیک نیتی سے اپنے مسلک کی حدیث بیان کرے (یا تائید بھی مطلوب نہ ہو) تو بھی قبول نہ کرنی چاہئیے کیونکہ وہ حدیث ہی ایسی بیان کرے گا جو اس کے عقیدے اور خیال کو

تقویت پہنچاتی ہوگی۔" (نزہہ النظر مطبوعہ علیمی دہلی صفحہ ۷۳)

اس مشورے کے بعد مسلمانوں کو چاہیئے کہ وہ پوری جرأت اور دلیری کے ساتھ اپنی تفاسیر کا جائزہ لیں اور ان میں تمام علوم کے متعلق مرویات کے بیان کرنے والے اشخاص کا محاسبہ کریں لیکن یہ محاسبہ تنہا اس نقطہ نظر سے نہ ہو کہ روایت میں کتنے شیعہ ہیں کیونکہ شیعہ کے علاوہ دوسرے راوی بھی تو تھے جن کا کام غلط فہمی پھیلانا یا انتشار کو فروغ دینا تھا۔ امید ہے کہ اس طرح تیرہ سو سال گزر جانے کے باوجود آپ اصل حقیقت کو پالیں گے۔ الذین جاھدوا فینا لنھدینھم سبلنا اور حقیقت کا پالینا بھی قرآن مجید کا معجزہ ہی ہے۔ کیا آپ خود "نظم قرآن" سے قرآن سمجھنا چاہتے ہیں؟ کیا آپ اس کے لئے آمادہ ہیں؟

غیرت قرآن اور علمی تقاضے آج کے مسلمانوں سے یہی سوال کرتے ہیں۔

❋ ❋